بانی ومہتمم :مفتی محمد رضا قادری نقشبندی مصباحی خلیفہ حضور شیخ العالم وسربراہ اعلیٰ علما کونسل نیپال   بفیض روحانی : مجمع الفضائل والبرکات،مظہر کمالات امام ربانی حضور شیخ العالم مولانا شاہ احمد رضا نقشبندی دامت برکاتہم العالیہ   قیادت :قائد ملت نیپال حضرت مولاناالحاج سید غلام حسین مظہری مرکزی صدر علما کونسل نیپال

Reg.No: 5310 -2082/2083

نیپال اردو ٹائمز
ہفت روزہ

Weekly
The NEPAL URDU TIMES

شمارہ نمبر ۷
ISSUE(7)

17/ستمبر 2026 مطابق 5/ربیع الثانی 1448ھ/1 گتے اسوج 2083

13صفحات

چیف ایڈیٹر:عبدالجبار علیمی نظامی
weeklynepalurdutimes@gamil.com

جلد نمبر ۲
VOL:(2)

عالمی برادری موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کو کم کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے: وزیر اعظم شاہ

احمد رضا ابن عبد القادر اویسی
نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
کاٹھمانڈو

وزیر اعظم بالیندرا (بالین) شاہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۸۱ویں اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک روانگی کے لیے تیار ہیں، جہاں وہ ۲۴ ستمبر ۲۰۲۶ کو جنرل اسمبلی سے خطاب کریں گے۔ وزیر اعظم کا یہ پہلا غیر ملکی دورہ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب نیپال تاریخ کے شدید ترین موسمیاتی بحران اور حالیہ تباہ کن سیلابوں کے اثرات سے نبرد آزما ہے۔ نیپال نے عالمی برادری سے 'لاس اینڈ ڈیمیج فنڈ' کے تحت ہنگامی مالی امداد اور موسمیاتی انصاف کا مطالبہ کر دیا ہے۔ حالیہ ہفتوں میں نیپال اور تبت کے سرحدی علاقوں میں آنے والے مٹی کے تودے گرنے اور 'بھوٹے کوشی اور تریشولی' کے تباہ کن سیلاب نے بڑے پیمانے پر تباہی مچائی ہے، جس میں اب تک ۱،۰۰۰ سے زائد افراد جان بحق ہو چکے ہیں اور ہزاروں تاحال لاپتہ ہیں۔ وزیر اعظم بالین شاہ نے "گھراپجھونگ کلائمیٹ کانفرنس" (مستانگ) میں اپنے خصوصی پیغام میں واضح کیا کہ یہ کوئی عام سیلاب نہیں تھا بلکہ پگھلتے ہوئے گلیشیئرز، خشک ہوتے آبی ذخائر اور بدلتے ہوئے ماحولیاتی نظام کا شاخسانہ ہے جو عالمی موسمیاتی تبدیلیوں کی براہِ راست عکاسی کرتا ہے۔ نیپال کے ماحولیاتی ماہرین اور حکومتی حکام کے مطابق: عالمی گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں نیپال کا حصہ ۰.۱ فیصد سے بھی کم ہے، لیکن وہ اس بحران سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔ حالیہ تباہی کے بعد ملک کی دوبارہ تعمیرِ نو اور بحالی کے لیے ۴.۷۸ ارب ڈالر کی خطیر رقم درکار ہے۔ نیپال کے وفد کا بنیادی ایجنڈا درج ذیل نکات پر مشتمل ہو گا: بڑے صنعتی ممالک، جو کاربن کے اخراج کے اصل ذمہ دار ہیں، انہیں نیپال جیسے ہمالیائی ممالک کے نقصانات کا ازالہ کرنا ہو گا۔ نیپال نے پہلی بار باضابطہ طور پر اقوام متحدہ کے اس فنڈ سے ہنگامی معاوضے اور فنڈز کی آسان فراہمی کا مطالبہ کیا ہے۔ گلیشیئرز کو پگھلنے سے بچانے اور ماحولیاتی طور پر پائیدار انفراسٹرکچر کی تعمیر کے لیے عالمی تعاون کی اپیل۔ وزیر اعظم کے مطابق، موسمیاتی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنا اب کسی ایک ملک کے بس کی بات نہیں رہا۔ یہ ایک مشترکہ عالمی ذمہداری ہے۔ اگر عالمی برادری نے فوری طور پر ترقی پذیر اور ماحولیاتی طور پر کمزور ممالک کی مالی اور تکنیکی مدد نہ کی، تو ہمالیائی خطے کی یہ تباہی پوری دنیا کے ماحولیاتی توازن کو بگاڑ کر رکھ دے گی۔

ہم یہاں سیاست سیکھنے نہیں بلکہ سکھانے آئے ہیں: وزیر داخلہ گرونگ

احمد رضا ابن عبد القادر اویسی نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
کاٹھمانڈو

وزیر داخلہ سوڈان گرونگ نے روایتی سیاست دانوں اور پرانے سیاسی نظام کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ نئی نسل حکومت میں سیاست سیکھنے کے لیے نہیں بلکہ ملک چلانے کا درست طریقہ سکھانے آئی ہے۔ ان کا یہ بیان نیپال کی موجودہ نازک سیاسی صورتحال اور اقتدار میں نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی شراکت داری کے تناظر میں انتہائی اہمیت کا حامل قرار دیا جا رہا ہے۔ سوڈان گرونگ، جو بنیادی طور پر ایک سماجی کارکن اور غیر سرکاری تنظیم "ہامی نیپال" کے بانی ہیں، ملک میں ہونے والے حالیہ بڑے نوجوانوں کے احتجاجی مظاہروں کے بعد ایک اہم سیاسی قوت بن کر ابھرے ہیں۔ وہ راشٹریہ سواتنترا پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن جیت کر پارلیمنٹ کا حصہ بنے اور مارچ ۲۰۲۶ میں ملک کے وزیر داخلہ کا منصب سنبھالا۔ گزشتہ دنوں وزیر داخلہ کے اثاثوں اور سرمایہ کاری کے حوالے سے کچھ اپوزیشن حلقوں کی جانب سے سوالات اٹھائے گئے تھے۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار قائم کرتے ہوئے سوڈان گرونگ نے آزادانہ تحقیقات کے لیے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ تاہم، تحقیقاتی کمیٹی کی جانب سے تمام الزامات سے کلیئرنس ملنے کے بعد، ۹ جون ۲۰۲۶ کو انہیں دوبارہ باقاعدہ طور پر وزیر داخلہ کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ دوبارہ عہدہ سنبھالنے کے بعد وزیر داخلہ نے اپنے عزم کو دہراتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت کا مقصد پرانے فرسودہ نظام کا خاتمہ، کرپشن کے خلاف زیرو ٹالرنس اور ملک میں شفاف طرزِ حکومت کو فروغ دینا ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ: موجودہ حکومت کا مقصد پرانے رہنماؤں کی کرپشن، اقربا پروری اور انتظامی نااہلی کی پیروی کرنا نہیں بلکہ ان غلطیوں کو سدھار کر ایک شفاف نظام لانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پرانے رہنما اور ان کے پیروکار جتنا چاہیں دباؤ ڈالیں یا رکاوٹیں کھڑی کریں، وہ عوام اور نوجوانوں سے کیے گئے گڈ گورننس کے وعدوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ وہ ملکی سیاست کو کسی ایک مذہب یا نظریے کے بجائے "انسانیت کے مذہب" اور سیکیولرازم کے اصولوں پر چلانے کے حامی ہیں۔

بھوٹیکوشی سیلاب: یتیم اور متاثرہ بچوں کی طویل مدتی دیکھ بھال حکومت کی ذمہ داری ہوگی: وزیر سیتا بادی

احمد رضا ابن عبد القادر اویسی
نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
کاٹھمانڈو

وفاقی وزیر برائے خواتین، بچے، معمر شہری و سماجی تحفظ ،سیتا بادی نے اعلان کیا ہے کہ حکومت بھوٹیکوشی دریا میں آنے والے ہولناک سیلاب اور آفت کے نتیجے میں یتیم ہونے والے اور خصوصی تحفظ کے حقدار بچوں کی طویل مدتی دیکھ بھال اور مستقل تحفظ کی مکمل ذمہ داری اٹھائے گی۔ نیپال میں قومی یومِ اطفال ۲۰۸۳ کے موقع پر جاری کیے گئے اپنے ایک خصوصی پیغام میں وزیر سیتا بادی کا کہنا تھا کہ حالیہ تباہ کن سیلاب نے متعدد خاندانوں کو شدید متاثر کیا ہے، جہاں کئی معصوم بچوں نے اپنے پیاروں کو کھو دیا ہے

اور متعدد زخمی حالت میں زیر علاج ہیں۔ حکومت ان بچوں کو اس مشکل گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑے گی۔ تعلیمی اور رہائشی وظائف کا تحفظ: نیپال کی باگمتی صوبائی حکومت نے بھی ایک اہم کابینہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ سیلاب کے باعث اپنے والدین سے محروم ہونے والے بچوں کو بارہویں جماعت (گریڈ ۱۲) تک مفت رہائش اور تعلیم فراہم کی جائے گی۔ تعلیمی تنظیموں کا اربوں روپے کا فنڈ: نجی تعلیمی اداروں کی تنظیموں وزارتِ تعلیم کے اشتراک سے ۱ ارب نیپالی روپے کا خصوصی اسکالرشپ بینک قائم کیا ہے، جس کے تحت آفت سے متاثرہ ایک ہزار (۱،۰۰۰) سے زائد طلبہ کو رہائشی اور تعلیمی وظائف دیے جائیں گے۔ حالیہ رپورٹس کے مطابق، بھوٹیکوشی سیلاب سے بڑے پیمانے پر اسکول، پل اور پن بجلی کے منصوبے تباہ ہوئے ہیں۔ نیشنل پلاننگ کمیشن کی ابتدائی تشخیص کے مطابق، تعلیمی اداروں اور بنیادی ڈھانچے کی بحالی و تعمیرِ نو کے لیے مجموعی طور پر تقریباً ۲۳.۴ ارب نیپالی روپے کی ضرورت کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ وزیر سیتا باڈی نے زور دیا کہ حکومت مقامی بلدیات اور فلاحی تنظیموں کے ساتھ مل کر تمام متاثرہ بچوں کو نفسیاتی صدمے سے نکالنے اور ان کی محفوظ نشوونما کے لیے جامع اقدامات کو یقینی بنا رہی ہے۔

تلاش اور بچاؤ میں حکومتی ناکامی، معصوم شہری وقت سے پہلے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے: آرین رائے

احمد رضا ابن عبد القادر اویسی
نمائندہ نیپال اردو ٹائمز

کاٹھمانڈو نیپال میں سیلاب اور لینڈ سلائیڈنگ کی تباہ کاریوں کے درمیان تلاش اور بچاؤ کی کارروائیوں میں حکومتی سستی پر سیاسی اور عوامی حلقوں میں شدید برہمی پائی جا رہی ہے۔ شرم شکتی پارٹی کے چیف وہپ اور رکن پارلیمنٹ آرین رائے نے حکومت پر کڑی تنقید کرتے ہوئے الزام عائد کیا ہے کہ انتظامیہ کی کمزوری اور لاپروائی کے باعث کئی قیمتی انسانی جانیں بروقت نہ بچائی جا سکیں۔ منگل (۱۵ ستمبر ۲۰۲۶) کو نیپالی ایوانِ نمائندگان (پارلیمنٹ) کے اجلاس کے دوران سیلاب کی صورتحال پر گرما گرم بحث ہوئی۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آرین رائے نے بھوٹے کوشی، رسوا اور دیگر شدید متاثرہ اضلاع کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان علاقوں میں تلاش اور امدادی سرگرمیاں انتہائی سست روی کا شکار ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ اگر حکومت بروقت

اور مؤثر اقدامات کرتی تو کئی شہریوں کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا جا سکتا تھا۔ آرین رائے نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ سیلاب سے متاثرہ دور دراز علاقوں میں ماہرین، سیکیورٹی اہلکاروں اور ضروری وسائل کی شدید کمی ہے، جس کی وجہ سے مقامی لوگ بے یار و مددگار ہیں۔ انہوں نے جذباتی انداز میں کہا، "حکومت کی نااہلی اور سست ردعمل کی وجہ سے معصوم شہری وقت سے پہلے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، جس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ شرم شکتی پارٹی کے رہنما نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام دستیاب وسائل کو فوری طور پر بروئے کار لائے، متاثرہ اضلاع میں ماہر امدادی ٹیمیں روانہ کرے اور بچ جانے والے افراد کی بحالی کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کام شروع کرے۔ واضح رہے کہ نیپال کے مختلف حصوں میں حالیہ دنوں میں ہونے والی تیز بارشوں، بھوٹے کوشی ندی میں طغیانی اور لینڈ سلائیڈنگ نے بڑے پیمانے پر تباہی مچائی ہے، جس کے بعد حکومت کی آفات سے نمٹنے کی حکمتِ عملی پر مسلسل سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

عوام مشکلات، مہنگائی اور افراتفری کا شکار، حکومت ذمہ داری قبول کرے: ایم پی ایشودا برال

احمد رضا ابن عبد القادر اویسی
نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
کاٹھمانڈو

کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والی رکن پارلیمنٹ یشودا برال نے ملک کی موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتحال پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ پارلیمنٹ کے ہنگامی وقت کے دوران خطاب کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ ملک کے عوام شدید مشکلات، کمر توڑ مہنگائی اور بڑھتی ہوئی افراتفری کا شکار ہیں، جس کی تمام تر اخلاقی اور انتظامی ذمہ داری موجودہ حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ایم پی یشودا برال نے اپنے خطاب میں کہا کہ حکومت ملک میں امن و امان برقرار رکھنے اور شہریوں کے بنیادی مسائل حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ انہوں نے امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر گہرے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ سے فوری طور پر عہدے سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ عوامی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مارکیٹ میں اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو چکی ہیں جبکہ تعلیمی اداروں کی فیسوں میں بے تحاشہ اضافہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے گھریلو صارفین کے لیے بجلی پر ٹیکس عائد کرنے کے حکومتی فیصلے کی سخت مذمت کرتے ہوئے اسے "عوام کے کچن پر براہِ راست حملہ" قرار دیا اور حکومت سے اسے فوری واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب کوئی وزیر یا بااثر شخصیت بیمار ہوتی ہے تو حکومت فوری طور پر ہیلی کاپٹر کا انتظام کر دیتی ہے، جبکہ دوسری طرف ہسپتالوں میں غریب مریضوں کو اسٹریچر اور بنیادی ادویات تک میسر نہیں ہوتیں۔ ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے یشودا برال نے سنسری اور دیگر اضلاع میں حالیہ مذہبی و فرقہ وارانہ کشیدگی کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو جان بوجھ کر افراتفری کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور اگر حکومت نے فوری طور پر امن و امان قائم کرنے کے لیے سنجیدہ اقدامات نہ کیے تو صورتحال مزید سنگین ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپیل کی کہ حکومت خوابِ غفلت سے جاگے اور عوام کو ریلیف فراہم کرنے کے لیے ہنگامی اقدامات کرے۔

حضرت مولانا سلامت علی رضوی کو عمرہ کی عظیم سعادت مبارک ہو

پریس ریلیز نیپال اردو ٹائمز

قاضی نیپال فاؤنڈیشن کے صدر، حضرت مولانا سلامت علی رضوی صاحب، زیارتِ حرمین شریفین کے لیے ۱۰ ستمبر کو قطر سے روانہ ہوئے۔ آپ نے پانچ دن مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور عمرہ کی عظیم سعادت، طوافِ کعبہ جیسی اہم عبادت اور حاضریِ حرم سے اپنے دل و جان کو منور کیا۔ نیز آبِ زمزم کے پاکیزہ پانی سے اپنے جسم و روح کو معطر و مطہر فرمایا۔
گزشتہ تین دنوں سے آپ مدینہ منورہ میں، کعبۃُ الکعبہ، جانِ کائنات، حضورِ اکرم ﷺ کے روضۂ انور کی زیارت سے مشرف ہو رہے ہیں اور اس عظیم سعادت کے ذریعے اپنے دامنِ دل کو مزید نور و برکت سے بھر رہے ہیں۔
آپ علمائے اہلِ سنت، ملک و ملت اور امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے دعائیں بھی فرما رہے ہیں۔
اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سلامت علی رضوی صاحب کے عمرہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ان کی تمام عبادات و دعاؤں کو قبول فرمائے اور ہم سب کے حق میں ان کی جانب سے کی جانے والی دعاؤں کو بھی شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین یارب العالمین۔
از قلم: نائب صدر قاضی نیپال فاؤنڈیشن

قاضی نیپال فاؤنڈیشن یونٹ دوحہ قطر نے ہر ماہ مالی تعاون کرنے کا عزم مصمم کیا ہے نیپال اردو ٹائمز ادارتی ٹیم اس کے لیے مذکورہ فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کرتی ہے، اللہ کریم اپنے امان میں رکھے

Weekly The
NEPAL URDU TIMES
Reg.No: 5310 -2082/2083 - www.nepalurdutimes.com
ہفت روزہ
نیپال اردو ٹائمز

ایران ناکہ بندی: امریکہ نے ۱۰۳ تجارتی جہاز روکے

فلوریڈا:(ایجنسیاں)امریکی سینٹرل کمانڈ (سینٹ کام) نے منگل کو کہا کہ اس کی افواج نے اب تک ۱۰۳ تجارتی جہازوں کا رخ موڑا ہے۔ یہ کارروائی آبنائے ہرمز میں ایران کے خلاف امریکی ناکہ بندی اور تجارتی پابندیوں کی پابندی یقینی بنانے کے لیے کی گئی۔ سینٹ کام نے ایکس پر جاری بیان میں کہا کہ ۱۵ ستمبر تک ۱۰۳ تجارتی جہازوں کا رخ موڑا جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ امریکی بحریہ کے ہیلی کاپٹر کی ویڈیو بھی شیئر کی گئی، جو بحیرہ عرب میں موجود امریکی جنگی جہاز یو ایس ایس رافیل پر الٹا سے پرواز کر رہا تھا۔ سینٹ کام نے کہا، "ایم ایچ-۶۰ سی ہاک ہیلی کاپٹر یو ایس ایس رافیل پر الٹا (ڈی ڈی جی ۱۱۵) کے عرشے سے پرواز کرتا ہے، جبکہ یہ جہاز بحیرہ عرب میں ایران کے خلاف امریکی ناکہ بندی پر عمل درآمد کرا رہا ہے۔ ۱۵ ستمبر تک امریکی افواج نے پابندیوں کی تعمیل یقینی بنانے کے لیے ۱۰۳ تجارتی جہازوں کا رخ موڑا ہے۔" ایران کے خلاف جاری امریکی جنگ کے دوران بحری ناکہ بندی بھی جاری ہے۔ امریکی کانگریس کے بجٹ دفتر (سی بی او) کی حالیہ رپورٹ کے مطابق یکم اگست ۲۰۲۶ تک ایران کے خلاف جنگی کارروائیوں پر امریکی محکمہ دفاع کو تقریباً ۳۸

ارب ڈالر خرچ ہو چکے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر لڑائی کی شدت جولائی کی سطح تک پہنچتی ہے تو ماہانہ اخراجات ۳ ارب ڈالر تک بڑھ سکتے ہیں۔ امریکی کانگریس کے لیے بجٹ اور اقتصادی تجزیہ فراہم کرنے والے غیر جانب دار ادارے سی بی او نے اپنی رپورٹ "ایران کے خلاف جنگی کارروائیوں کی لاگت کا تخمینہ" کے عنوان سے جاری کی ہے۔ یہ پیش رفت ایسے وقت میں سامنے آئی ہے جب امریکہ، اسرائیل اور سات عرب ممالک کے اعلیٰ فوجی کمانڈروں نے گزشتہ ہفتے جرمنی میں ایک خفیہ اجلاس کیا۔ ایکسیوس نے دو اسرائیلی حکام کے حوالے سے بتایا کہ اجلاس میں ایران کے خلاف جاری جنگ اور مشرق وسطیٰ میں وسیع تر سکیورٹی کشیدگی پر غور کیا گیا۔ یہ اعلیٰ سطحی اجلاس امریکی سینٹرل کمانڈ کے سربراہ ایڈمرل بریڈ کوپر نے منعقد کیا تھا، تاہم کسی بھی شریک حکومت نے اس کا باضابطہ اعلان نہیں کیا۔ امریکہ اور اسرائیل کے ایران کے ساتھ جنگ کی حالت میں آنے کے چھ ماہ سے زیادہ عرصے بعد یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا۔ ایکسیوس کے مطابق اجلاس میں ایڈمرل بریڈ کوپر نے کمانڈروں کو یقین دلایا کہ ایرانی حملوں کے باوجود امریکی فوج کا خطے سے اپنی افواج واپس بلانے کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ ایران مسلسل خطے میں موجود امریکی فوجی اڈوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ انہوں نے آبنائے ہرمز سے گزرنے والی بحری ٹریفک میں اضافے کے لیے واشنگٹن کی حکمت عملی سے بھی شرکا کو آگاہ کیا۔

دوسری جانب اسرائیلی دفاعی افواج کے چیف آف اسٹاف جنرل ایال زامیر نے مختلف محاذوں پر جاری اسرائیلی فوجی کارروائیوں کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔ ادھر ایرانی وزیر خارجہ سید عباس عراقچی ۱۶ ستمبر کو چین کا دورہ کریں گے، جہاں وہ اپنے چینی ہم منصب وانگ یی سے ملاقات کریں گے۔ چین کی وزارت خارجہ نے منگل کو اس کی تصدیق کی۔ چینی وزارت خارجہ نے ایکس پر جاری بیان میں کہا، "ایران کے وزیر خارجہ سید عباس عراقچی ۱۶ ستمبر کو چین کا دورہ کریں گے۔ کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مرکزی کمیٹی کے سیاسی بیورو کے رکن اور وزیر خارجہ وانگ یی ان سے بات چیت کریں گے۔" عراقچی کا یہ دورہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب چینی صدر شی جن پنگ کے ۲۴ ستمبر کو امریکہ کے متوقع دورے کی تیاریاں جاری ہیں۔ اس دوران شی جن پنگ کی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے ملاقات متوقع ہے۔

ایران کا بڑا دعویٰ، ۲۴ گھنٹے میں آبنائے ہرمز میں ۳ امریکی ڈرون مار گرائے

تہران:(ایجنسیاں) مغربی ایشیا میں امریکہ کے ساتھ جاری کشیدگی اور تنازع کے درمیان ایران کے اسلامی پاسداران انقلاب (IRGC) نے بڑا دعویٰ کیا ہے۔ IRGC کے مطابق، اس نے گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران آبنائے ہرمز کے اوپر ۳ امریکی MQ-1 پریڈیٹر ڈرون مار گرائے ہیں۔ ایرانی فوج کے مطابق اس کارروائی میں جدید فضائی دفاعی نظام کا استعمال کیا گیا۔ IRGC نے بتایا کہ اس کی ایرو اسپیس فورس نے آبنائے ہرمز کے اوپر پرواز کرنے والے امریکی بغیر پائلٹ طیارے کو انٹیگریٹڈ ایئر ڈیفنس نیٹ ورک کے ذریعے پکڑا اور کارروائی کرتے ہوئے تباہ کر دیا۔ آبنائے ہرمز عالمی سطح پر ایک اہم تزویراتی آبی گزرگاہ ہے۔ امریکی دعووں کے درمیان ایران کا بڑا دعویٰ

ایرانی نیوز چینل پریس ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق، امریکی ڈرون کو ایران کے مربوط فضائی دفاعی نیٹ ورک کے کنٹرول میں رہتے ہوئے نشانہ بنایا گیا۔ اس سے چند گھنٹے قبل بھی IRGC نے آبنائے ہرمز کے اوپر ایک اور امریکی MQ-1 ڈرون کو روک کر مار گرانے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایران کا یہ دعویٰ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی انتظامیہ مسلسل ایران کے فضائی دفاعی نظام کو تباہ کرنے کے دعوے کر رہی ہے۔ دونوں جانب سے سامنے آنے والے دعووں کے درمیان خطے میں فوجی کشیدگی برقرار ہے۔ امریکی ڈرون کے بارے میں IRGC نے کیا کہا؟

IRGC کے شعبہ تعلقات عامہ نے بتایا کہ امریکی ڈرون ایک کثیر المقاصد اور طویل عرصے تک پرواز کرنے کی صلاحیت رکھنے والا ریموٹلی پائلٹڈ طیارہ تھا۔ ایرانی حکام کے مطابق، ڈرون کسی بھی ممکنہ جارحانہ کارروائی سے قبل ہی ایرانی فضائی دفاعی نظام کی نگرانی میں آ گیا تھا۔ IRGC کے مطابق، ایرانی فضائی دفاعی نظام نے ڈرون کا فوری طور پر سراغ لگایا اور اس کی نگرانی شروع کر دی۔ اس کے بعد زمین سے فضا میں مار کرنے والے جدید میزائلوں کے ذریعے اسے نشانہ بنایا گیا اور تباہ کر دیا گیا۔ ایران کے تازہ دعووں کے مطابق، گزشتہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران اس نے مجموعی طور پر ۳ امریکی MQ-1 ڈرونز کو روک کر تباہ کیا ہے۔ گزشتہ ہفتے بھی امریکی ڈرون گرانے کا دعویٰ

ایران نے گزشتہ ہفتے بھی آبنائے ہرمز کے اوپر ایک امریکی MQ-1 ڈرون مار گرانے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایرانی فوج کی فضائی دفاعی یونٹ نے بتایا تھا کہ جنوب مشرقی ایران میں موجود اس کی فضائی دفاعی یونٹس نے امریکی ڈرون کا سراغ لگایا، اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی اور پھر اسے نشانہ بنا کر تباہ کر دیا۔ ایران کی جانب سے مسلسل امریکی ڈرونز کو نشانہ بنانے کے یہ دعوے ایسے وقت میں سامنے آ رہے ہیں جب آبنائے ہرمز اور وسیع تر مغربی ایشیا میں امریکہ اور ایران کے درمیان کشیدگی عروج پر ہے۔

امریکہ کے لاس اینجلز میں نیوز چینل کا ہیلی کاپٹر حادثہ کا شکار، ۱۳ افراد ہلاک

واشنگٹن: (ایجنسیاں) امریکہ کے لاس اینجلز واقع سین فرنانڈو ویلی میں ایک میڈیا ادارہ کا ہیلی کاپٹر حادثہ کا شکار ہو گیا ہے۔ لاس اینجلز فائر بریگیڈ ڈپارٹمنٹ کے مطابق جائے وقوع پر ۳ لوگوں کی موت بھی ہو گئی ہے۔ ابتدائی رپورٹ میں ایک شخص کی ہلاکت کے بارے میں بتایا گیا تھا، لیکن بعد میں ۳ اموات کی تصدیق کی گئی۔ یہ حادثہ چیٹس ورتھ علاقہ میں اسی جگہ پر پیش آیا جہاں کچھ ہی گھنٹوں پہلے ایک سڑک حادثہ ہوا تھا۔ موصولہ اطلاع کے مطابق ہیلی کاپٹر 'این بی سی ۴' میڈیا ادارہ کا تھا، جو میٹرو بس اور ایس یو وی کی زبردست ٹکر کی کوریج کر رہا تھا۔ اس سڑک حادثہ میں بھی کئی لوگوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع سامنے آ رہی ہے۔ فائر بریگیڈ کے اہلکاروں کا کہنا ہے کہ یہ ہیلی کاپٹر حادثہ ۲ کمرشیل عمارتوں کے درمیان نارتھ میسن ایوینیو کے ۹۱۰۰ بلاک کے پاس پیش آیا۔ ہیلی کاپٹر وہاں کھڑے ۲ شپنگ کنٹینروں اور کئی گاڑیوں کے اوپر جا گرا۔ حادثہ کے پیچھے کی وجہ فی الحال صاف نہیں ہو پائی ہے، لیکن جانچ شروع کر دی گئی ہے۔ حادثہ کے فوراً بعد ہی وہاں شدید آگ لگ گئی، جسے بجھانے کے لیے لاس اینجلز فائر ڈپارٹمنٹ کی ٹیمیں جائے وقوع پر پہنچیں۔ اس دوران اسکائی کیل ہیلی کاپٹر اوپر سے پورے واقعہ کی کوریج کرتا رہا۔ آگ بجھانے کے بعد فائر بریگیڈ اہلکاروں اور لاس اینجلز پولیس نے ایک لاش کے اوپر کینوپی لگا دی۔ پولیس اور فائر ڈپارٹمنٹ دونوں ہی اس حادثہ کی جانچ میں مصروف ہیں۔ ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا ہے کہ حادثہ زدہ ہیلی کاپٹر میں کتنے لوگ سوار تھے

ملائیشیا کے وزیر اعظم انور ابراہیم کی گرانڈ مفتی شیخ ابو بکر احمد سے ملاقات

تعلیمی و ثقافتی تعاون کو فروغ دینے اور ہندوستانی برادری کے مسائل پر گفتگو

نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
سید ظہیر احمد فنا

کالی کٹ (عبدالکریم امجدی): ملائیشیا کے وزیر اعظم داتو سری انور ابراہیم نے اتوار کو کیرالہ کے کالی کٹ میں واقع مرکز الثقافۃ السنیہ کا دورہ کیا اور گرانڈ مفتی آف انڈیا شیخ ابو بکر احمد سے ملاقات کی۔

پانچ روزہ دورہ ہند کے تحت نئی دہلی میں برکس سربراہ اجلاس میں شرکت کے بعد وزیر اعظم انور ابراہیم مرکز پہنچے، جہاں مرکز کے ورکنگ سکریٹری ڈاکٹر محمد عبدالحکیم ازہری اور سکریٹری سی محمد فیضی کی قیادت میں وفد نے ان کا استقبال کیا۔

اس کے بعد وزیر اعظم نے گرانڈ مفتی آف انڈیا شیخ ابو بکر احمد کے ساتھ خصوصی ملاقات کی۔ ملاقات میں مرکز اور ملائیشیا کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے درمیان تعلیمی روابط کے فروغ اور باہمی تعلیمی و علمی تبادلے کو مزید مضبوط بنانے پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

دونوں رہنماؤں نے تعلیم، ثقافت اور علمی میدانوں میں تعاون کے نئے امکانات پر بھی تبادلہ خیال کیا۔

اس موقع پر ملائیشیا میں مقیم ہندوستانی برادری کی فلاح و بہبود سے متعلق مختلف امور بھی زیر بحث آئے۔

مرکز کنونشن سنٹر میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں "شیخ ابو بکر فاؤنڈیشن ایکسیلینس ایوارڈ" وزیر اعظم انور ابراہیم کو پیش کیا گیا۔ یہ ایوارڈ انسانی خدمت، سماجی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لیے نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کی حوصلہ افزائی اور اعتراف خدمت کے طور پر دیا جاتا ہے۔

اس موقع پر گرانڈ مفتی آف انڈیا شیخ ابو بکر احمد سے ایک اہم ملاقات کا انعقاد کیا گیا۔ انڈیا نے گزشتہ تین برسوں کے دوران حکومت ملائیشیا کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی مجالس تلاوت حدیث کے انعقاد پر اظہار تشکر کرتے ہوئے وزیر اعظم کو صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ بطور تحفہ پیش کیا۔

استقبالیہ تقریب میں کیرالہ کے وزیر صنعت پی کے کنھالی کٹی، کرناٹک کے وزیر صحت یوٹی قادر، سمستھا کیرالہ جمعیتہ العلماء کے رہنما ای سلیمان مسلیار، سید علی باقفیہ، سید ابراہیم الخلیل البخاری، عبدالرحمن ثقافی، سی محمد فیضی، وی پی ایم فیضی، رکن اسمبلی رزاق ماسٹر، کٹور عبدالرحمن حاجی، اے پی عبدالکریم حاجی چالی یم سمیت مذہبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور کاروباری شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے بھی شرکت کی۔

سعودی عرب کی تیل کی اہم پائپ لائن بند، عالمی منڈی پر بڑا خطرہ منڈلانے لگا

ریاض:(ایجنسیاں)

سعودی عرب کی مشرق سے مغرب تک جانے والی اہم تیل پائپ لائن پر ڈرون حملے کے بعد اس کی ترسیل عارضی طور پر معطل کر دی گئی، جس سے عالمی تیل کی فراہمی کا ۵ فیصد تک حصہ متاثر ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

عرب میڈیا کی خصوصی رپورٹ کے مطابق تقریباً ۱۲۰۰ کلومیٹر طویل پائپ لائن سعودی عرب کے مشرقی تیل پیدا کرنے والے علاقوں کو بحیرہ احمر کی بندرگاہ ینبع سے ملاتی ہے۔ اس پائپ لائن کے ذریعے سعودی عرب آبنائے ہرمز کو نظر انداز کرتے ہوئے روزانہ تقریباً ۴ سے ۵ ملین بیرل خام تیل مغربی ساحل تک پہنچا سکتا ہے۔ سعودی وزارتِ توانائی کے مطابق ریاض اور مدینہ کے علاقوں میں پائپ لائن کو ڈرون حملوں سے نقصان پہنچا اور بعض افراد بھی زخمی ہوئے جس کے بعد احتیاطی اقدام کے طور پر آپریشن معطل کر دیا گیا۔ سعودی حکام کے مطابق ڈرون حملے عراق کے جنوب مشرقی صوبے میسان سے کیے گئے جو ایرانی سرحد کے قریب ہے، جہاں ایران نواز مسلح گروپوں کی موجودگی رہی ہے۔

ایران کا آبنائے ہرمز میں امریکی پریڈیٹر ڈرون مار گرانے کا دعویٰ

تہران (ایجنسیاں)۔ ایران کی سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی (آئی آر جی سی) نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی فضائیہ نے آبنائے ہرمز کے اوپر ایرانی فضائی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ایک امریکی ایم کیو-۱ پریڈیٹر ڈرون کو مار گرایا۔ ڈرون کو زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ ایرانی پریس ٹی وی کے مطابق، آئی آر جی سی کے محکمہ تعلقات عامہ نے منگل کو جاری ایک بیان میں کہا کہ اس کے فضائی دفاعی نظام نے امریکی ڈرون کا پتہ لگایا اور اسے ٹریک کرنے کے بعد کسی بھی مبینہ جارحانہ کارروائی سے پہلے ہی تباہ کر دیا۔

ایرانی فوج کے مطابق، گزشتہ ہفتے بھی جنوب مشرقی ایران میں اس کے فضائی دفاعی یونٹوں نے ایک امریکی ایم کیو-۱ ڈرون کا پتہ لگایا تھا۔ فوج نے دعویٰ کیا تھا کہ ڈرون کو ٹریک کرنے کے بعد کامیابی سے نشانہ بنا کر مار گرایا گیا۔ تاہم، ان واقعات کی امریکہ کی جانب سے فوری طور پر آزادانہ تصدیق سامنے نہیں آئی ہے۔ آبنائے ہرمز ایران اور امریکہ کے درمیان بڑھتی ہوئی فوجی کشیدگی کے درمیان ایک اہم اسٹریٹجک علاقہ بن گیا ہے۔ خلیج فارس اور خلیج عمان کو ملانے والا یہ آبی راستہ عالمی توانائی کی فراہمی کے لیے انتہائی اہم سمجھا جاتا ہے۔ ایران نے خطے میں فوجی سرگرمیاں بڑھانے کے ساتھ ساتھ سمندری آمد و رفت پر بھی سخت کنٹرول کرنے کی وارننگ دی ہے۔ اس کے باعث آبنائے ہرمز میں جہازوں کی سلامتی اور بین الاقوامی تجارت کے حوالے سے تشویش بڑھ گئی ہے۔

سعودی عرب کا حوثی باغیوں کے خلاف اسرائیل پر انحصار!

ریاض:(ایجنسیاں) حوثی باغیوں نے سعودی عرب کے متعدد شہروں اور فوجی اڈوں پر بیلسٹک میزائلوں اور ڈرونز کا استعمال کرتے ہوئے بڑے حملے کیے ہیں۔ یمن کے بحیرہ احمر کے ساحل اور آبنائے باب المندب پر حوثیوں کے قبضے کے بعد سعودی عرب نے مدد کے لیے اسرائیل سے رابطہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ سعودی عرب اسرائیل کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم نہیں کرتا اور دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں ہیں۔ دی یروشلم پوسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیل اور سعودی عرب نے امریکی سینٹرل کمانڈ کی ثالثی میں بات چیت کی۔ بات چیت میں سعودی عرب اور حوثی باغیوں کے درمیان انٹیلی جنس سپورٹ کے ذریعہ حالات کو معمول پر لانے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ اسرائیل کے دوسرے اخبار میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ محمد بن سلمان نے بالواسطہ طور پر امریکی سینٹرل کمانڈ کے ذریعہ اسرائیل سے رابطہ کیا تھا اور آبنائے باب المندب میں لاحق خطرات کے حوالے سے انٹیلی جنس مدد طلب کی تھی۔ سعودی عرب کے توانائی کے بنیادی ڈھانچے پر کئی ہفتوں کے چھٹپٹ ڈرون اور میزائل حملوں کے بعد، حوثیوں نے گزشتہ ہفتے یمن میں جارحانہ کارروائی شروع کی، جس سے سعودی حمایت یافتہ اتحاد کی تمام مخالفتوں کو ختم کر دیا گیا۔ حوثی باغیوں کے اچانک حملے نے انہیں بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع باب المندب جزیروں کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ آبنائے باب المندب سعودی عرب کے لیے ایک اہم سمندری راستہ ہے، جس نے اسے آبنائے ہرمز کی کسی بھی ممکنہ ایرانی ناکہ بندی سے گریز کرتے ہوئے محفوظ طریقے سے تیل برآمد کرنے کی اجازت دی۔ آبنائے باب المندب بند کر دیا گیا ہے اور سعودی عرب کے وسیع اندرونی پائپ لائن نیٹ ورک کو بھی حملوں میں نشانہ بنایا گیا ہے۔ سمندری راستے کی بندش اور زمینی پائپ لائن نیٹ ورک کو پہنچنے والے نقصان نے سعودی عرب کے متبادل تیل کی نقل و حمل کے بنیادی ڈھانچے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے۔ سعودی عرب نے اسرائیل سے اس لیے رابطہ کیا ہے کیونکہ وہ حوثیوں کا سامنا کر رہا ہے۔ ۲۰۲۳ میں غزہ میں جنگ شروع ہونے کے بعد حوثیوں نے بحیرہ احمر میں اسرائیل کے اتحادی جہازوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ رپورٹ کے مطابق سعودی عرب کو اسرائیلی امداد انٹیلی جنس تک محدود رہے گی

امریکہ اور یمنی حوثیوں کا براہ راست رابطہ: جے ڈی وینس

واشنگٹن:(ایجنسیاں) امریکی نائب صدر جے ڈی وینس نے پیر کے روز کہا ہیکہ یمنی حوثیوں کے ساتھ براہ راست رابطے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہیکہ کسی انتہائی اعلیٰ امریکی عہدیدار نے ایرانی حمایت یافتہ حوثیوں کے ساتھ رابطوں کا انکشاف کیا ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ سعودی عرب کے خلاف کافی متحرک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حوثیوں نے اپنے حملوں میں اضافہ کرتے ہوئے تجارتی جہازوں کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے مختلف شہروں میں بھی حملوں کی کوشش کی ہے۔ حالیہ ہفتوں میں سعودی عرب کے بیسیوں شہری ان حملوں میں زخمی ہوئے ہیں۔ اس صورتحال میں ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کی امریکی فوجی عہدیدار سے جدہ میں ملاقات بھی ہوئی ہے۔ اس سے قبل الاع سامنے آئی تھی کہ صدر ٹرمپ اور ولی عہد کے درمیان کئی بار رابطہ ہو چکا ہے جس میں حوثیوں کے خلاف کارروائیوں کیلئے کہا گیا۔ تاہم صدر ٹرمپ نے جواب میں کہا کہ امریکہ حوثیوں کے بارے میں انٹیلی جنس انفارمیشن دے سکتا ہے۔ اب امریکی نائب صدر نے اعلان کیا ہیکہ ان کے حوثیوں کے ساتھ براہ راست رابطے ہیں

وزارت داخلہ قانون کے مطابق چل رہی ہے یا ذاتی اثر ورسوخ کے تحت؟

نیپال اردو ٹائمز
محمد رضوان احمد مصباحی

کاٹھمنڈو: نیپال کی اہم اپوزیشن جماعت نیپالی کانگریس نے وزارت داخلہ کے انتظامی طریقۂ کار پر سوالات اٹھاتے ہوئے حکومت سے وضاحت طلب کی ہے کہ آیا وزارت داخلہ قانونی ضابطوں اور مقررہ طریقۂ کار کے مطابق کام کر رہی ہے یا ذاتی اثر و رسوخ اور من مانی کے تحت۔ نمائندہ ایوان زیریں کے بدھ کے اجلاس میں کانگریس کے چیف وہپ نشکل رائی نے وزارت داخلہ کے کردار پر اظہار تشویش کرتے ہوئے کہا کہ وزارت داخلہ ریاست کے حساس ترین محکموں میں شامل ہے، جس کی بنیادی ذمہ داری قانون کی حکمرانی، امن و امان کے قیام اور شہریوں کو ریاست کی جانب سے تحفظ کا احساس دلانا ہے۔رائی نے کہا کہ حالیہ واقعات کے تناظر میں یہ سنجیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وزارت داخلہ کا انتظام قانون اور مقررہ طریقۂ کار کے مطابق چل رہا ہے یا کسی فرد کے ذاتی اثر و رسوخ اور خواہش کے مطابق۔

انہوں نے کہا کہ عوامی سطح پر یہ باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں کہ بعض مخصوص گروہ اور افراد وزارت داخلہ کے انتظامی امور پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ تاہم، انہوں نے ایسے افراد یا گروہوں کے نام لینے سے گریز کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی نظام کو ایسے غیر واضح اثرات سے پاک ہونا چاہیے۔

کانگریس کے چیف وہپ نے جین زی شہید یادگاری پروگرام میں وزیر داخلہ سدھن گرونگ کے خطاب اور بعض متنازع شخصیات کی موجودگی پر بھی سوال اٹھایا۔ انہوں نے سوال کیا کہ شہداء کی یاد میں منعقدہ پروگرام میں کسی ایک مذہب یا فرقے کی نمائندگی کرنے والی متنازع مذہبی شخصیات کو اگلی صف میں جگہ دے کر حکومت عوام کو کیا پیغام دینا چاہتی ہے؟ ان کے مطابق یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ آیا ایسا طرزِ عمل آئین کی فراہم کردہ سمت سے ہم آہنگ ہے۔ رائی نے پروگرام میں شہریوں اور اداروں کے حوالے سے مبینہ دھمکی آمیز زبان کے استعمال پر بھی تشویش ظاہر کی اور سوال اٹھایا کہ ایسی زبان استعمال کرنے کی جرأت کہاں سے حاصل ہوئی۔"دوسروں کو سیاست سکھانے سے پہلے شہریوں کے دکھ کو سمجھیں" وزیر داخلہ سدھن گرونگ کے اس بیان پر بھی کانگریس کے چیف وہپ نے تنقید کی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ سیاست سیکھنے نہیں بلکہ سیاست سکھانے آئے ہیں۔

رائی نے کہا کہ ہر شخص کو سیاست سکھانے کا حق حاصل ہے، لیکن سیاست کا پہلا سبق یہ ہے کہ شہریوں کی تکالیف اور مشکلات کے تئیں حساسیت کا مظاہرہ کیا جائے، پارلیمان کے وقار کو سمجھا جائے، ریاستی اداروں کا احترام کیا جائے اور اپنی کمزوریوں کو تسلیم کیا جائے۔

واضح رہے کہ ۲۳ بھادرا کو منعقدہ جین زی شہید یادگاری پروگرام میں وزیرِ داخلہ سدھن گرونگ نے خطاب کرتے ہوئے سیاست سیکھنے کے بجائے سیاست سکھانے سے متعلق بیان دیا تھا، جس کے بعد ان کے بیان پر سیاسی حلقوں میں بحث شروع ہوئی۔

بجٹ اخراجات میں تیزی لانے کے لیے وزیر اعلیٰ کا افسران کو سختی سے کام کرنے کی ہدایت۔

نیپال اردو ٹائمز
محمد رضوان احمد مصباحی

سرخیت، نیپال — کرنالی پردیش کے وزیر اعلیٰ منگل بہادر شاہی نے صوبے میں بجٹ کے مؤثر، شفاف اور نتیجہ خیز استعمال کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں تیزی لانے کے لیے انتظامیہ کو ہدایات جاری کی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صوبے کی مجموعی ترقی اور بجٹ کے اخراجات میں اضافہ کے لیے سرکاری ملازمین کو گزشتہ برسوں کے مقابلے میں مزید تیز رفتاری سے کام کرنا ہوگا۔

وزیر اعلیٰ نے یہ ہدایات بدھ کے روز وزیر اعلیٰ و کابینہ کے دفتر کی جانب سے منعقدہ مالی سال ۲۰۸۲/۸۳ کی سالانہ جائزہ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے دیں۔ انہوں نے بجٹ پر عمل درآمد کے دوران پیش آنے والی رکاوٹوں اور مسائل کی نشاندہی کر کے انہیں فوری طور پر حل کرنے کی ہدایت کی۔

منگل بہادر شاہی نے کہا کہ اگر کام کی رفتار بہتر بنانے کے لیے قوانین اور ضوابط میں ترمیم کی ضرورت ہو تو اس سلسلے میں بھی اقدامات کیے جائیں، جبکہ ملازمین کو تربیت کی ضرورت ہو تو انہیں مناسب تربیت فراہم کی جائے۔ تاہم مقررہ وقت میں کام مکمل کرنا اور مختص بجٹ کو شفاف اور مؤثر انداز میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ وزیر اعلیٰ نے مقامی سطح پر ترقیاتی کاموں کو مؤثر بنانے کے لیے مقامی حکومتوں کے ساتھ بہتر اور مضبوط رابطہ و تعاون پر بھی زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ صوبائی اور مقامی حکومتوں کے درمیان مؤثر ہم آہنگی سے سرکاری پروگراموں اور منصوبوں کے عمل درآمد کو مزید نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔

بجٹ کا تقریباً ۵۵ فیصد خرچ:

مالی سال ۲۰۸۲/۸۳ میں وزیرِ اعلیٰ و کابینہ کے دفتر کے لیے مجموعی طور پر ۶ ارب ۶۲ کروڑ ۶ لاکھ نیپالی روپے کا بجٹ مختص کیا گیا تھا۔ دفتر کے مطابق آساڑ کے اختتام تک اس میں سے ۳ارب ۶۷ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے خرچ کیے جا چکے تھے، جو کل بجٹ کا ۵۵٫۳۱ فیصد ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق کرنالی پردیش ٹریننگ اکیڈمی نے اپنے بجٹ کا ۴۷٫۱۱ فیصد، وزیر اعلیٰ کرنالی روزگار پروگرام نے ۶۱ فیصد، جبکہ صوبائی و مقامی حکمرانی معاونت پروگرام نے ۵۸٫۱۳ فیصد بجٹ خرچ کیا۔ سالانہ جائزہ اجلاس میں چیف سیکریٹری رادھیکا آریال نے بھی دفتر کی مالی پیش رفت کو توقعات کے مطابق نہ قرار دیتے ہوئے آئندہ دنوں میں بہتری کی ضرورت پر زور دیا۔

نومولود کی آمد پر والدین کو زیادہ وقت: والدہ کے لیے ۶ ماہ اور والد کے لیے ۴۲ دن چھٹی دینے کی تجویز۔

نیپال اردو ٹائمز
محمد رضوان احمد مصباحی

کاٹھمنڈو/نیپال: بچے کی آمد صرف ایک خاندان میں نئے فرد کا اضافہ نہیں، بلکہ زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتی ہے۔ ماں کے لیے یہ مرحلہ جسمانی اور جذباتی طور پر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، جبکہ باپ کے لیے بھی نومولود اور ماں کی دیکھ بھال میں بھرپور شرکت کا وقت ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیپال حکومت نے محفوظ زچگی اور تولیدی صحت کے حقوق سے متعلق قانون میں اہم ترمیم کی تیاری شروع کر دی ہے۔

حکومت کی جانب سے تیار کیے گئے 'محفوظ زچگی و تولیدی صحت کے حقوق ایکٹ، ۲۰۷۵' میں ترمیمی بل میں ملازمت پیشہ ماؤں کو تنخواہ سمیت کم از کم چھ ماہ کی زچگی چھٹی اور باپ کو ۴۲ دن تک تنخواہ سمیت زچگی نگہداشت کی چھٹی دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

موجودہ قانون کے تحت خواتین کو ۹۰ دن اور مرد ملازمین کو ۱۵ دن کی چھٹی حاصل ہے۔ مجوزہ ترمیم قانون کی منظوری کی صورت میں ان دونوں مدتوں میں نمایاں اضافہ کرے گی۔

قانون، انصاف و پارلیمانی امور کی وزیر سویتا گوتم نے اس تجویز کو محفوظ زچگی اور ذمہ دارانہ والدین کے تصور کے حوالے سے اہم پالیسی تبدیلی قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بچے کو جنم دینا ماں سے وابستہ ایک فطری عمل ہے، لیکن بچے کی پرورش اور نگہداشت صرف ماں کی ذمہ داری نہیں بلکہ والدین دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ وزیر گوتم کے مطابق زندگی میں والدین بننے کا مرحلہ عموماً محدود مواقع پر آتا ہے، اس لیے اس اہم وقت میں والدین کو اپنے نومولود اور خاندان کے لیے مناسب وقت میسر آنا چاہیے۔ ان کے بقول والدین کو یہ وقت فراہم کرنا محض ملازم کی سہولت نہیں بلکہ ریاست کی بھی ذمہ داری ہے۔

ماں کے حق میں چھ ماہ کی تنخواہ سمیت چھٹی: مجوزہ ترمیمی بل میں موجودہ قانون کی دفعہ ۱۳ میں تبدیلی کی تجویز دی گئی ہے۔ اس کے تحت سرکاری، غیر سرکاری اور نجی اداروں میں کام کرنے والی خواتین کو بچے کی پیدائش سے قبل یا بعد کم از کم چھ ماہ تک تنخواہ سمیت زچگی چھٹی حاصل کرنے کا قانونی حق دینے کی تجویز ہے۔

یہ تبدیلی موجودہ ۹۰ روزہ زچگی چھٹی کے مقابلے میں خاصا بڑا اضافہ ہوگی اور نومولود بچے کی ابتدائی نگہداشت کے لیے ماں کو زیادہ وقت فراہم کرے گی۔

مجوزہ قانون کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ نومولود کی نگہداشت کو صرف ماں تک محدود رکھنے کے بجائے والد کو بھی اس ذمہ داری میں باقاعدہ شریک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجوزہ شق کے مطابق اگر کسی مرد ملازم کی اہلیہ بچے کو جنم دینے والی ہو تو اسے بچے کی پیدائش سے قبل یا بعد ۴۲ دن تک تنخواہ سمیت زچگی نگہداشت کی چھٹی دی جائے گی۔ موجودہ قانون میں یہ مدت صرف ۱۵ دن ہے۔

حکومت کا موقف ہے کہ بچے کی ابتدائی پرورش اور ماں کی دیکھ بھال میں باپ کی موجودگی بھی خاندان کے لیے اہم ہے اور اس کے لیے قانونی سہولت فراہم کرنا ضروری ہے۔ آفات کے دوران ماں اور نومولود کی صحت کو ترجیح: مجوزہ قانون میں قدرتی آفات اور ہنگامی حالات کے دوران محفوظ زچگی اور نومولود بچوں کی طبی خدمات کو خصوصی ترجیح دینے کی بھی تجویز پیش کی گئی ہے۔

اس کے تحت صحت اداروں کو آفت کے دوران محفوظ زچگی، ہنگامی زچگی خدمات، نومولود بچوں کی انتہائی ضروری طبی سہولیات اور محفوظ اسقاطِ حمل کی خدمات کو ترجیح دینا ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی صحت اداروں کو جدید سائنسی اور طبی ٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت دینے کی تجویز بھی بل میں شامل کی گئی ہے، تاکہ بدلتے ہوئے طبی تقاضوں کے مطابق صحت خدمات کو مزید مؤثر بنایا جاسکے۔

ترمیمی بل میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق موجودہ اصطلاح میں بھی تبدیلی کی تجویز دی گئی ہے۔ حکومت نے 'خاندانی منصوبہ بندی' کے بجائے 'خاندان کی منصوبہ بندی' کی اصطلاح استعمال کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ جبری اسقاط حمل کے خلاف قانونی شکنجہ مزید مضبوط ہوگا: مجوزہ قانون میں جبری اسقاطِ حمل کے خلاف بھی سخت قانونی انتظامات کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے موجودہ قانون کی متعلقہ دفعات میں ترمیم کی جائے گی۔

مجوزہ شق کے مطابق اگر کسی حاملہ خاتون کے خلاف دشمنی یا کسی دوسرے سبب سے ایسا عمل کیا جائے جس کے نتیجے میں اس کا حمل ضائع ہو جائے، تو بعض حالات میں اسے جبری اسقاطِ حمل تصور کیا جائے گا، چاہے اس عمل کا براہِ راست مقصد اسقاطِ حمل نہ بھی ہو۔

اسی طرح اگر کسی حاملہ خاتون کو دباؤ، دھمکی، فریب، ترغیب یا لالچ کے ذریعے اسقاطِ حمل پر مجبور کیا جائے یا اس میں مدد کی جائے تو اسے بھی جبری اسقاطِ حمل کے زمرے میں شامل کرنے کی تجویز ہے۔

مجوزہ قانون میں یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر کسی عمل کے نتیجے میں حمل ضائع ہو جائے اور بچہ زندہ پیدا ہونے کے بعد فوری طور پر فوت ہو جائے، یا کسی حاملہ خاتون کو جان سے مارنے کی کوشش کے دوران اس کا حمل ضائع ہو جائے، تو ایسے واقعات کو بھی جبری اسقاطِ حمل سے متعلق قانونی دفعات کے تحت لایا جاسکے گا۔

پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی تیاری: حکومت نے ترمیمی بل کا مسودہ تیار کر لیا ہے اور اب اسے وزراء کی کونسل کے ذریعے آگے بڑھانے کے بعد پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔

مجوزہ قانون کی منظوری کی صورت میں نیپال میں زچگی کی چھٹی، والد کی نومولود نگہداشت میں شرکت، ہنگامی حالات میں زچگی و نوزائیدہ خدمات اور جبری اسقاطِ حمل سے متعلق قانونی نظام میں نمایاں تبدیلیاں متوقع ہوں گی۔

پارلیمنٹ کی بے توقیری برداشت نہیں۔ گگن تھاپا

نیپال اردو ٹائمز
محمد رضوان احمد مصباحی

کاٹھمنڈو: نیپالی کانگریس کے صدر گگن تھاپا نے وزیر اعظم بالین شاہ کے طرز عمل پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت کی جانب سے پارلیمنٹ اور پارلیمانی کمیٹیوں کو مطلوبہ اہمیت نہ دینے کا تاثر پیدا ہو رہا ہے۔ انہوں نے وزیر اعظم کو پارلیمانی اداروں کے وقار اور ذمہ داریوں کا خیال رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔

تھاپا نے بدھ کے روز راشٹریہ سوتنترا پارٹی (راسوپا) کے صدر روی لامیچھانے کی جانب سے بلائی گئی کل جماعتی میٹنگ کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ اجلاس میں بھوٹے کوشی سیلاب کے بعد بحالی اور تعمیر نو کے کاموں کو مؤثر انداز میں آگے بڑھانے کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ اجلاس میں سیلاب کے بعد حکومتی اقدامات کی نگرانی کے لیے پارلیمنٹ میں خصوصی کمیٹی تشکیل دینے اور روی لامیچھانے کی قیادت میں اعلیٰ سطحی سیاسی رابطہ و مشاورتی نظام کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

گگن تھاپا نے کہا کہ اب یہ سوال اہم ہے کہ پارلیمانی خصوصی کمیٹی کی جانب سے تیار کی جانے والی رپورٹ کو وزیر اعظم اور حکومت کس طرح لیتی ہے۔ ان کے مطابق اگر کمیٹی اپنی رپورٹ پیش کرتی ہے تو حکومت کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا اور ضرورت کے مطابق اقدامات کرنا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ پارلیمنٹ میں اب تک اہم اپوزیشن جماعت کے رہنما کی جانب سے خطاب کے دوران وزیر اعظم کی موجودگی نظر نہیں آئی۔ ان کے بقول، پارلیمنٹ کے ادارے کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا رویہ محسوس کیا جارہا ہے، اسی پس منظر میں پارلیمانی خصوصی کمیٹی تشکیل دینے اور اسے ذمہ داری دینے کی بات سامنے آئی ہے۔

تھاپا نے مزید کہا کہ اگر وزیر اعظم خود پارلیمانی کمیٹی کے وقار، اختیار اور ذمہ داری کو نظر انداز کرتے رہے تو اس صورت میں آگے کیا قدم اٹھایا جائے گا، یہ بھی ایک اہم سوال ہوگا۔

انہوں نے بتایا کہ کل جماعتی اجلاس میں وزیر اعظم کی پارلیمنٹ اور پارلیمانی کمیٹیوں کے تئیں جواب دہی کے معاملے کو بھی اٹھایا گیا اور حکومت کو اس حوالے سے متوجہ کرنے کی بات ہوئی۔

نیپالی کانگریس کے صدر نے کل جماعتی اجلاس طلب کرنے پر راسواپا کے صدر روی لامیچھانے کا شکریہ بھی ادا کیا

نیپال سیلاب: ملکی وغیر ملکی ماہرین کی مدد لیتے تو کئی جانیں بچ سکتیں: پرچنڈ

احمد رضا ابن عبدالقادر اویسی
نمائندہ نیپال اردو ٹائمز
کاٹھمانڈو

سابق وزیر اعظم اور کمیونسٹ پارٹی آف نیپال (ماؤسٹ سینٹر) کے چیئرمین پشپا کمل دہال 'پرچنڈ' نے ملک میں حالیہ سیلاب اور مٹی کے تودے گرنے کی تباہی پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے حکومتی حکمت عملی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اگر حکومت آفت کے آغاز ہی میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین کی مدد لے لیتی تو سرنگوں اور دیگر مقامات پر پھنسے ہوئے متعدد افراد کی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔ رپورٹ کے مطابق نیپال کے ہمالیائی خطے، بالخصوص رسوا اور بھوٹے کوشی کے اضلاع میں سیلاب اور لینڈ سلائیڈنگ نے بڑے پیمانے پر تباہی مچائی ہے۔ بھوٹے کوشی ہائیڈرو پاور پراجیکٹ کی سرنگوں میں درجنوں ورکرز پھنسے ہوئے ہیں، جنہیں نکالنے کے لیے ریسکیو آپریشن تاحال جاری ہے۔ میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے اپوزیشن رہنما پرچنڈ نے کہا کہ حکومت نے آفت کے ابتدائی چار سے پانچ دنوں کے دوران مجرمانہ غفلت اور تکبر کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کہا:"اگر ہم شروع سے ملکی اور غیر ملکی ماہرین کی مدد لیتے تو اور بہت سی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔ سرنگوں میں پھنسے لوگوں کو بچانے کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی اور ماہرین کی ضرورت تھی، لیکن حکومت نے وقت پر درست فیصلہ نہیں کیا۔" انہوں نے اس بحران کو محض ایک عام قدرتی آفت کے بجائے موسمیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ایک "عظیم ہمالیائی آفت" قرار دیا اور بین الاقوامی برادری سے فوری مدد کی اپیل کی۔ واضح رہے کہ نیپال میں جاری اس موسمیاتی تباہی کے نتیجے میں اب تک ۱،۴۰۰ سے زائد افراد جان کی بازی ہار چکے ہیں جبکہ ۵،۰۰۰ کے قریب افراد لاپتہ ہیں، جس کے باعث ہلاکتوں میں مزید اضافے کا خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ تباہی کے بعد اب نیپالی فوج کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی ریسکیو ٹیمیں اور ماہرین بھی امدادی کارروائیوں میں شامل ہو چکے ہیں۔

Published By: Ulama Foundation Nepal, Bhairahwa, Rupandehi Lumbini Pradesh Nepal, Reg: 372860
Email:- weeklynepalurdutimes@gmail.com, Web site: www.nepalurdutimes.com, Contact:- +91 8795979383, +977 9817619786, +9779821442810

علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال اپنے نئے مشن کی جانب تیزی سے گامزن، تمام حضرات سے تعاون کی پُر خلوص اپیل

نیپال گنج،۱۶ستمبر ۲۰۲۶ء:
علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال روز بروز اپنے سماجی، انسانی اور فلاحی مشن کو مزید وسعت دیتے ہوئے خدمتِ خلق کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے ضرورت مندوں، متاثرین اور پریشان حال افراد تک امداد پہنچانے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اتحاد، بھائی چارے اور باہمی تعاون کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

حالیہ دنوں میں نیپال کے مختلف علاقوں میں آنے والے سیلاب سے متاثرہ افراد کی امداد کے لیے بھی علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال کی جانب سے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مساجد، مدارس اور عوام کے تعاون سے امدادی رقم جمع کرنے اور اسے مستحقین تک پہنچانے کا سلسلہ جاری ہے۔ فاؤنڈیشن کا یہ عزم ہے کہ خدمتِ انسانیت کا یہ سلسلہ کسی ایک موقع تک محدود نہ رہے بلکہ آئندہ بھی مختلف سماجی اور فلاحی میدانوں میں منظم انداز سے کام جاری رکھا جائے۔

اسی سلسلے میں علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال کی جانب سے تمام علمائے کرام، مشائخِ عظام، ائمۂ مساجد،

ذمہ دارانِ مدارس، سماجی شخصیات، نوجوانانِ ملت اور تمام مخلص احباب سے پُر خلوص گزارش کی گئی ہے کہ وہ فاؤنڈیشن کے اس نیک اور فلاحی مشن میں اپنا تعاون پیش کریں۔

تمام حضرات اپنے اپنے حلقۂ احباب میں علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال کے خدمتِ خلق کے پیغام کو عام کریں، فاؤنڈیشن کے ساتھ وابستہ ہوں اور اپنے قیمتی مشوروں، دعاؤں اور ممکنہ تعاون کے ذریعے اس مشن کو مزید مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے کہا گیا ہے کہ اجتماعی تعاون اور باہمی اتحاد کے ذریعے ہی خدمتِ انسانیت کے کاموں کو مزید منظم اور مؤثر انداز میں آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ آج آپ کا تعاون کسی ضرورت مند خاندان کے لیے سہارا اور کسی متاثرہ شخص کے لیے امید کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال اپنے تمام معاونین، خیر خواہوں اور مخلص احباب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ خدمتِ انسانیت، فلاحِ معاشرہ اور ضرورت مندوں کی مدد کے اس سفر کو اخلاص، اتحاد اور باہمی تعاون کے ساتھ مزید آگے بڑھایا جائے گا۔

تمام حضرات سے خصوصی اپیل ہے کہ علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال کا ساتھ دیں، اس کے مشن کو مضبوط بنائیں اور خدمتِ انسانیت کے اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ضرور شامل کریں۔

علماء فاؤنڈیشن بانکے نیپال
نیپال اردو ٹائمز
+9779701714929

علما فاؤنڈیشن کی جانب سے کپلوستو کے چیف ڈسٹرکٹ آفیسر (CDO) کو میمورنڈم

پریس ریلیز
نیپال اردو ٹائمز
مورخہ: ۳۰ بھادو ۲۰۸۳، بروز منگل

کپلوستو: سوشل میڈیا کے ذریعے اسلام اور مسلم معاشرے کے خلاف قابلِ اعتراض اور نفرت انگیز مواد نشر کیے جانے کے معاملے میں غیر جانب دارانہ تحقیقات اور قانون کے مطابق ضروری کارروائی کا مطالبہ کرتے ہوئے علما فاؤنڈیشن نیپال، کپلوستو کی جانب سے کپلوستو کے چیف ڈسٹرکٹ آفیسر کو میمورنڈم پیش کیا گیا۔

علما فاؤنڈیشن کے ضلعی صدر صدام حسین کی قیادت میں ایک وفد نے کپلوستو کے چیف ڈسٹرکٹ آفیسر جناردن گوتم سے ملاقات کی اور معاشرے میں مذہبی ہم آہنگی، امن و امان اور باہمی بھائی چارے کو برقرار رکھنے کے لیے مذکورہ معاملے کی سنجیدگی سے تحقیقات کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے میمورنڈم پیش کیا۔

میمورنڈم میں ذکر کیا گیا ہے کہ سوشل میڈیا، خصوصاً فیس بک پر "پریم یوگی" نامی اکاؤنٹ سے اسلام، مسلم معاشرے اور مذہبی جذبات کے خلاف قابلِ اعتراض اور نفرت پھیلانے والے مختلف مضامین اور مواد پوسٹ کیے جا رہے ہیں۔

فاؤنڈیشن کے ضلعی صدر صدام حسین نے کہا کہ اس طرح کی سرگرمیاں صرف کسی ایک مذہبی طبقے کے جذبات کو مجروح نہیں کرتیں بلکہ معاشرے میں مذہبی کشیدگی، باہمی بداعتمادی اور تناؤ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی ہم آہنگی کو بھی متاثر کر سکتی ہیں۔

علما فاؤنڈیشن نے مطالبہ کیا کہ اس معاملے کو معمولی نہ سمجھا جائے بلکہ غیر جانب دارانہ اور سنجیدہ تحقیقات کرتے ہوئے، اگر الزامات درست ثابت ہوں تو مروجہ قانون کے مطابق ذمہ دار شخص کے خلاف ضروری قانونی کارروائی کی جائے۔

میمورنڈم وصول کرتے ہوئے کپلوستو کے چیف ڈسٹرکٹ آفیسر جناردن گوتم نے معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے ضروری تحقیقات اور قانونی عمل کو آگے بڑھانے کی یقین دہانی کرائی۔

صدام حسین صدر
علی حسن نظامی۔ نائب صدر
احمد یار خاں۔ سیکریٹری
نصر اللہ امجدی۔ مشیر
قمر الدین، نور محمد نظامی

ماں کی گود بحیثیت تربیت گاہ

محمد کلام الدین نعمانی مصباحی امجدی نائب ایڈیٹر، نیپال اردو ٹائمز

دنیا میں بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کی عظمت کو الفاظ کا لباس پہنانا ممکن نہیں، والدین کا رشتہ انہی عظیم رشتوں میں سے ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کے وجود سے انسان کی زندگی کو سہارا ملتا ہے، جن کی دعاؤں سے راستے آسان ہوتے ہیں اور جن کی قربانیاں اولاد کے مستقبل کی بنیاد بنتی ہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں اپنی عبادت کے فوراً بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا۔ ارشاد فرمایا:

"وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا" (سورۃ الِاسراء: ۲۳)

اور تمہارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ (کنز الایمان)

نیز والدین کے بڑھاپے کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡہَرۡہُمَا وَقُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا" (ایضا)

اور ان سے ہوں نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ (کنز الایمان)

اور پھر والدین کے لیے یہ دعا سکھائی:

"رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا" (ایضا، ۲۴) "اور عرض کر کہ اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے چھٹپن میں پالا"۔ (کنز الایمان)

خصوصاً ماں کی قربانیوں کو قرآنِ مجید نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان فرمایا:

"حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی وَہۡنٍ" (سورۃ لقمان: ۱۴) اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔

گویا قرآن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ماں کا حق محض اس لیے عظیم نہیں کہ وہ ماں ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے اولاد کے لیے جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر بے شمار قربانیاں دی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی ماں کے مقام کو غیر معمولی اہمیت عطا فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری ماں۔

اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں۔

پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں۔"

پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمہارا باپ۔

(صحیح البخاری، کتاب الأدب؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب)

یہ تین مرتبہ "ماں" کہنا اس کے مقام، قربانی اور خدمت کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

ماں کا کردار پہلی درس گاہ

بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک ایسے مسافر کی مانند ہوتا ہے جسے راستوں کا کوئی علم نہیں۔ اسے زبان نہیں آتی، آدابِ زندگی معلوم نہیں ہوتے، اچھے اور برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔

اور اس ماحول کا سب سے پہلا، سب سے قریبی اور سب سے مؤثر کردار ماں کا ہوتا ہے۔

بچہ سب سے پہلے ماں کا چہرہ دیکھتا ہے، ماں کی آواز سنتا ہے، ماں کی گود میں سکون پاتا ہے اور ماں کے ذریعے دنیا سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے:

"ماں بچے کی پہلی درس گاہ ہے، ماں کی گود اس کا پہلا مدرسہ اور ماں کا کردار اس کا پہلا نصاب ہے"۔ اس درس گاہ میں نہ بلیک بورڈ ہوتا ہے، نہ چاک، نہ گھنٹی اور نہ ہی امتحانی پرچہ؛ لیکن یہاں ہر لمحہ تعلیم جاری رہتی ہے۔ ماں کا ہر لفظ ایک سبق، ہر عمل ایک مثال اور ہر رویہ بچے کے لیے ایک خاموش پیغام ہوتا ہے۔

ماں کے کردار کا اثر

ماں کے کردار کا سب سے زیادہ دل کو چھو لینے والا واقعہ وہ ہے جو قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے۔

ایک ماں اپنے شیر خوار بچے کو اپنے سینے سے جدا کر کے دریا کے حوالے کر رہی ہے، مگر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر کامل یقین ہے۔ (طٰہٰ: ۳۹، القصص: ۷)

یہ واقعہ ہر ماں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اولاد کی محبت کے ساتھ اللہ پر توکل اور اس کے فیصلے پر اعتماد بھی ضروری ہے۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کی طرف واپس لوٹا دیا، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کریں۔

نیز اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد کی تربیت صرف ظاہری اسباب اور اپنی قوت پر بھروسہ کرنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ سے مضبوط تعلق اور اس پر کامل توکل بھی تربیت کا اہم حصہ ہے۔ خود بھی توکل کرے، اور بچوں کو بھی توکل علی اللہ کا درس دے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی پاکیزہ سیرت و کردار نے بچپن ہی سے اہلِ عرب کو متاثر کیا، اور آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کا اثر آپ کی پوری زندگی میں نمایاں رہا۔

اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی تربیت اور پاکیزہ کردار کا اثر حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کی زندگیوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ صبر، تقویٰ، شجاعت، عبادت، سخاوت، امانت و دیانت اور استقامت جیسی عظیم صفات ان کی شخصیت کا حصہ بنیں۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری زندگی صبر، حلم اور تقویٰ کا نمونہ پیش کیا، جبکہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے حق و صداقت کی خاطر اپنی جان اور اہل و عیال تک قربان کر دیے، مگر ظلم و باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ماں کی گود میں دی جانے والی تربیت کا اثر صرف بچپن تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ پوری زندگی انسان کے کردار، فیصلوں اور کردارِ عمل میں نمایاں ہوتا ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ کی ماں کی تربیت کا اثر

جلیل القدر امام، بلند پائے کے فقیہ و مجتہد حضرت امام محمد بن ادریس شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابتدائی زندگی بھی ہمیں ماں کی قربانی اور تربیت کا سبق دیتی ہے۔

ان کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں لے کر مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کیا تاکہ وہ اپنے خاندان اور علمی ماحول میں پرورش پائیں۔ غربت کے باوجود امام شافعی رضی اللہ عنہ علم حاصل کرنے میں آگے بڑھتے گئے اور کم عمری میں قرآنِ کریم حفظ کر لیا۔

سوانحی روایات میں آتا ہے کہ غربت کے سبب انہیں کاغذ میسر نہ تھا، چنانچہ وہ ہڈیوں اور دیگر دستیاب چیزوں پر اپنے اسباق لکھا کرتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء، ج۸، ص۷۷-۳-۷۹، و تاریخ دمشق، ج۵۱، ص۳۹۷ ملخصًا)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وسائل کی کمی اگر ارادہ مضبوط ہو تو کامیابی کی راہ نہیں روک سکتی۔

اور اس کامیابی کے پیچھے ایک ایسی ماں تھی جس نے اپنے بیٹے کی اچھی تربیت اور اس کے مستقبل کے لیے بہت مشکلات برداشت کیں۔

حضور غوثِ پاک رضی اللہ عنہ اور والدۂ ماجدہ کی تربیت

اسلامی تاریخ میں ماں کی تربیت کا ایک روشن اور قابلِ ذکر نمونہ حضور غوثِ اعظم، شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔

آپ کی والدۂ ماجدہ کا نام سیدہ اُم الخیر فاطمہ بیان کیا جاتا ہے۔ آپ ایک نیک، متقی اور صالح خاتون تھیں۔ سوانحی مصادر میں آپ کی والدہ کی تربیت اور کفالت کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔

آپ کے والد کا انتقال آپ کے بچپن میں ہو گیا، جس کے بعد آپ کی پرورش اور کفالت میں والدہ کا کردار مزید نمایاں ہو گیا۔ بعض سوانحی روایات کے مطابق آپ کی والدہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا اور آپ کو علم و دین کی راہ پر گامزن کیا۔

آپ کی شخصیت میں صدق، تقویٰ، علم، عبادت اور اللہ پر اعتماد کی جو صفات نمایاں ہوئیں، ان کے ابتدائی ماحول اور والدہ کی تربیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (ماخوذ از بہجۃ الاسرار، ص: ۱۶۷)

مشہور سوانحی روایت میں آتا ہے کہ جب آپ بغداد کے سفر پر روانہ ہوئے تو آپ کی والدہ نے آپ کو ہمیشہ سچ بولنے کی نصیحت فرمائی۔ اس سفر میں جب ڈاکوؤں نے قافلے کو لوٹا تو حضرت عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس موجود رقم کے بارے میں سچ بیان کر دیا۔ ڈاکوؤں کو حیرت ہوئی کہ جب جان و مال کا خطرہ ہے تو یہ نوجوان جھوٹ کیوں نہیں بولتا؟ آپ نے والدہ کی نصیحت کا حوالہ دیا۔ اس واقعے سے ڈاکوؤں کے دل متاثر ہوئے اور انہوں نے توبہ کی۔ (مفہوم از: بہجۃ الاسرار، ص ۲۵۶، قلائد الجواہر، ص: ۹)

یہ روایت سوانحی کتب میں مشہور ہے، اگرچہ اسے صحیح حدیث کے درجے کی روایت کے طور پر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا تربیتی پیغام نہایت عظیم ہے: ماں کی زبان سے بچپن میں نکلی ہوئی سچی نصیحت کبھی کبھی انسان کی پوری زندگی کا دستور بن جاتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی، اور والدہ کی تربیت

برصغیر کی علمی و دینی تاریخ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام علم، فقہ، عشقِ رسول ﷺ، تصنیف، تحقیق اور دینی بصیرت کے حوالے سے نمایاں ہے۔

آپ کے والد حضرت مولانا نقی علی خان خود ایک جلیل القدر عالم تھے، لیکن ایک عظیم عالم کی شخصیت سازی صرف مدرسے میں نہیں ہوتی؛ اس کے پیچھے گھر کا ماحول اور والدین کی تربیت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اعلیٰ حضرت کی سوانح میں ان کے والدین کی محبت، دینی ماحول اور تربیت کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شخصیت میں بچپن ہی سے دین سے وابستگی، علم کی محبت، رسول اللہ ﷺ سے گہری عقیدت اور دینی غیرت نمایاں ہوئی۔ (حیاتِ اعلیٰ حضرت، ص ۳۴)

یہاں اصل سبق یہ ہے کہ عظیم شخصیات کی تعمیر گھر کے ماحول سے شروع ہوتی ہے۔ اگر گھر میں دین کی محبت ہو، سچائی کا ماحول ہو اور والدین اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے فکر مند ہوں تو بچے کی شخصیت میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جو آگے چل کر معاشرے کے لیے روشنی بن جاتے ہیں۔

یوں ہی بچے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا ماں کی سب سے اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔

بچہ جب کھانا کھائے تو اسے بسم اللہ سکھائی جائے، نعمت ملے تو الحمد للہ، کسی سے ملے تو السلام علیکم، غلطی کرے تو معذرت اور کسی کی مدد کرے تو احسان نہ جتانے کی تربیت دی جائے۔

اسے قرآن کریم کی چھوٹی سورتیں، مسنون دعائیں، نبی کریم ﷺ کے اخلاق اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات، اولیائے کرام کے حقائق محبت بھرے انداز میں سنائے جائیں۔

نماز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مُرُوا اَوۡلَادَکُمۡ بِالصَّلَاۃِ وَہُمۡ اَبۡنَاءُ سَبۡعِ سِنِیۡنَ" (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ)

اپنی اولاد کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو۔ یہ تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ بچوں کی دینی تربیت آخری عمر تک مؤخر کرنے کے بجائے بچپن ہی سے شروع ہونی چاہیے۔

ماں کی تربیت: نصیحت سے زیادہ عمل

ماں بچے کی پہلی درس گاہ اور پہلی مربیہ ہوتی ہے۔ بچے صرف ماں کی باتوں سے نہیں، بلکہ اس کے عمل اور کردار سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ ماں نماز کی پابند، قرآن سے وابستہ، سچی، صابر اور بڑوں کا احترام کرنے والی ہو تو یہی اوصاف بچوں کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

بیٹی اپنی ماں سے حیا، خودداری، سلیقہ، علم اور ذمہ داری سیکھتی ہے، جبکہ بیٹا رحم، عدل، شرافت، خدمت، والدین کی اطاعت اور خواتین کے احترام کا درس پاتا ہے۔ اس لیے بیٹی اور بیٹے دونوں کی تربیت میں ماں کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

آج موبائل، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے دور میں ماں کی ذمہ داری مزید بڑھ گئی ہے۔ اسے بچوں کو صرف غلط چیزوں سے روکنا نہیں، بلکہ صحیح اور غلط میں فرق سمجھانا، ان کی بات سننا اور محبت و اعتماد کا ماحول فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ اور ماں کا کردار اس کی پہلی کتاب ہے۔ ایک نیک، باکردار اور باشعور ماں نہ صرف اپنے بچوں بلکہ آنے والی نسلوں کی بھی بہترین تربیت کر سکتی ہے۔

ماں کی گود سے قوموں کی تعمیر

ایک ماں بظاہر اپنے گھر کی چار دیواری میں رہتی ہے، مگر اس کا اثر چار دیواری تک محدود نہیں ہوتا۔

وہ جس بچے کو گود میں لے کر لوری سناتی ہے، وہی بچہ کل عالم، فاضل، محقق، مدبر، استاد، ڈاکٹر، انجینئر، قائد، سپاہی یا معاشرے کا ایک اہم فرد بن سکتا ہے۔

اس لیے ماں کی گود میں صرف ایک بچہ نہیں پل رہا ہوتا؛ ایک مستقبل پل رہا ہوتا ہے۔

ماں اگر ایک صالح انسان تیار کرتی ہے تو وہ دراصل ایک صالح خاندان کی بنیاد رکھتی ہے، اور صالح خاندان مل کر صالح معاشرہ بناتے ہیں۔

اسی مفہوم کو شاعر حافظ ابراہیم نے خوبصورت انداز میں کہا:

الأم مدرسة إذا أعددتها --- أعددت شعبا طيب الأعراق

یعنی ماں ایک مدرسہ ہے، اگر تم نے اسے اچھی تربیت دی تو گویا تم نے پاکیزہ نسلوں والی ایک پوری قوم تیار کر دی۔

ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

اگر ہمیں باکردار نسل چاہیے تو ماؤں کی تعلیم، تربیت اور کردار سازی کو اپنی ترجیحات میں شامل کرنا ہوگا۔ قرآن سے محبت، نماز کی پابندی، سچائی، والدین کا احترام اور اچھے اخلاق بچوں کو صرف نصیحت سے نہیں بلکہ عملی نمونے سے سکھائے جا سکتے ہیں۔

ماں صرف بچے کو جنم نہیں دیتی، بلکہ اس کے اندر انسان، کردار اور شعور کو جنم دیتی ہے۔ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ اور اس کا کردار پہلی کتاب ہے۔

ماں کی اصلاح، نسل کی اصلاح ہے؛ ماں کی تعلیم، نسل کی تعلیم ہے؛ اور ماں کا کردار، نسل کا کردار ہے۔

آج کی ماں کی گود میں بیٹھا بچہ ہی کل کا معاشرہ ہے۔ اگر اس گود میں ایمان، علم، اخلاق اور محبتِ رسول ﷺ ہو گی تو یہی اوصاف معاشرے میں پروان چڑھیں گے۔

لہٰذا ماں اپنی ذمہ داری پہچانے اور اپنی گود کو ایمان، علم، اخلاق اور محبت کی درس گاہ بنائے۔

ماں سنورے گی تو گھر سنورے گا، گھر سنورے گا تو نسل سنورے گی، اور نسل سنورے گی تو قوم کا مستقبل روشن ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہماری ماؤں کو صالح اور باکردار نسلوں کی بہترین مربی بنائے اور ہماری اولاد کو دنیا میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور آخرت میں صدقۂ جاریہ فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

از قلم:
محمد کلام الدین نعمانی مصباحی امجدی
نائب ایڈیٹر، نیپال اردو ٹائمز
بنوٹا، مہوتری، نیپال

Editorial

مسلم دنیا کو تقسیم کرنے کی سیاست کب ختم ہوگی؟

ایڈیٹر کے قلم سے۔۔۔۔۔

مشرقِ وسطیٰ ایک بار پھر جنگ اور کشیدگی کی لپیٹ میں ہے۔ غزہ، یمن، ایران، اسرائیل اور خلیجی ممالک کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازعات نے پورے خطے کے امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ حوثیوں کے حملوں، اسرائیلی فوجی کارروائیوں اور امریکہ کی خطے میں بڑھتی ہوئی عسکری سرگرمیوں نے حالات کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان جنگوں میں عام مسلمان ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھا رہے ہیں۔ کہیں گھر تباہ ہو رہے ہیں، کہیں بچے یتیم ہو رہے ہیں، کہیں خاندان بے گھر ہو رہے ہیں اور کہیں مہنگائی و معاشی بحران نے عوام کی زندگی اجیرن بنا دی ہے۔

امریکہ اور اسرائیل مشرقِ وسطیٰ میں اپنے اقدامات کو قومی سلامتی، دہشت گردی کے خاتمے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے نام پر پیش کرتے ہیں۔ تاہم، ان کی فوجی پالیسیوں اور خطے میں مداخلت پر مسلم دنیا اور کئی عالمی مبصرین کی جانب سے شدید سوالات اٹھائے جاتے ہیں، فلسطین میں طویل عرصے سے جاری بحران، غزہ کی تباہی، ایران کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی اور خطے میں مسلسل فوجی کارروائیوں نے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ کیا عالمی طاقتیں واقعی امن چاہتی ہیں یا اپنے سیاسی، فوجی اور معاشی مفادات کے لیے خطے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں؟

بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق مشرقِ وسطیٰ میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے، توانائی کے وسائل پر اثر و رسوخ قائم رکھنے اور اسرائیل کی علاقائی برتری کو تحفظ دینے کی پالیسیوں نے خطے کے مسائل کو مزید گہرا کیا ہے۔ تاہم، کسی بھی حکومت کے پوشیدہ ارادوں کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کے بجائے اس کی پالیسیوں، فوجی اقدامات اور عملی نتائج کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی، مسلکی، سیاسی اور علاقائی اختلافات پہلے ہی موجود ہیں۔ بیرونی طاقتیں جب ان اختلافات کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں تو حالات مزید خراب ہو جاتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم ممالک ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے بجائے باہمی مشاورت اور اتحاد کا راستہ اختیار کریں۔ اگر مسلمان ممالک آپس میں لڑتے رہیں گے تو ان کی توانائیاں ترقی، تعلیم، صحت اور عوامی بہبود کے بجائے جنگوں میں ضائع ہوتی رہیں گی۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ مسلم دنیا کے تمام مسائل کا ذمہ دار صرف بیرونی طاقتوں کو قرار دینا درست نہیں۔ ہماری اپنی سیاسی کمزوریاں، باہمی اختلافات، بدعنوانی، کمزور ادارے اور غلط پالیسیاں بھی موجودہ صورتِ حال کی اہم وجوہات ہیں۔ بیرونی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لیے داخلی اصلاح اور مضبوط اتحاد ضروری ہے۔

یمن کے حوثیوں کی جانب سے سعودی عرب، اسرائیل اور بحیرۂ احمر کے بعض تجارتی راستوں سے متعلق حملوں نے خطے میں کشیدگی بڑھا دی ہے۔ حوثی ان کارروائیوں کو فلسطین اور اپنے سیاسی مقاصد سے جوڑتے ہیں، جبکہ ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ حملے عالمی تجارت، علاقائی سلامتی اور عام شہریوں کے لیے خطرہ ہیں۔

ہم کسی بھی فریق کی جانب سے بے گناہ شہریوں کو نشانہ بنانے کی حمایت نہیں کر سکتے۔ فلسطینیوں کے حقوق، یمنی عوام کی سلامتی، خلیجی ممالک کا تحفظ اور خطے کے تمام انسانوں کا امن یکساں اہم ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ مسلم دنیا باہمی اختلافات سے اوپر اٹھے۔ بیرونی طاقتوں کی پالیسیوں کو جذبات کے بجائے حکمت، تحقیق اور اتحاد کے ساتھ سمجھا جائے۔ اپنے اندرونی مسائل کو دور کیا جائے اور عوام کو جنگ کے بجائے ترقی کا راستہ دیا جائے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ مسلم دنیا اور عالمی اداروں کو چاہیے کہ وہ یمن کے عوام کے لیے انسانی امداد، محفوظ راستوں اور مستقل جنگ بندی کی کوشش کریں۔

بھارت کے مدارس سے نیپال کے مسلمانوں کو کیا سیکھنا چاہیے؟

ڈاکٹر سلیم انصاری
جھاپا نیپال

بھارت میں مدارس کے حوالے سے گزشتہ چند برسوں کے دوران ہونے والی تبدیلیاں سنجیدہ غور و فکر کی متقاضی ہیں۔ آسام میں سرکاری مدارس کو عمومی اسکولوں میں تبدیل کرنے کا عمل، اتر پردیش میں مدرسہ قانون سے متعلق عدالتی بحث، اتراکھنڈ میں غیر تسلیم شدہ مدارس کے خلاف کارروائیاں اور مغربی بنگال میں حالیہ دنوں میں سیکڑوں مدارس کے خلاف انتظامی اقدامات نے مسلمانوں میں فطری تشویش پیدا کی ہے۔

ان واقعات کو نہ تو مکمل طور پر مذہبی تعصب کا نتیجہ قرار دینا مناسب ہے اور نہ ہی محض انتظامی کارروائی کہہ کر ان کے وسیع تر سیاسی اور سماجی اثرات کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اصل ضرورت یہ ہے کہ ہر معاملے کو اس کے حقائق، قانونی بنیاد اور عملی نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے۔

کسی بھی ریاست کو تعلیمی اداروں کے لیے بنیادی معیار، بچوں کی حفاظت، عمارتوں کی سلامتی، اساتذہ کی اہلیت، مالی شفافیت اور قانونی رجسٹریشن کے تقاضے مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ مدارس بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ تاہم، دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے ضابطے شفاف، غیر جانب دار اور یکساں طور پر نافذ کیے جائیں۔

اگر کسی ادارے میں انتظامی یا تعلیمی خامی موجود ہے تو اسے اصلاح کا موقع، واضح معیار اور مناسب قانونی طریقۂ کار فراہم کیا جانا چاہیے۔ محض مذہبی شناخت کی بنیاد پر کسی ادارے کو مشکوک سمجھنا ایک جمہوری اور کثیر المذہبی معاشرے کے لیے صحت مند رویہ نہیں ہوگا۔

بھارت کی موجودہ سیاسی فضا نے اس بحث کو مزید حساس بنا دیا ہے۔ ہندوتوا سیاست کے بڑھتے ہوئے اثرات نے مسلمانوں میں یہ احساس ضرور پیدا کیا ہے کہ ان کے مذہبی اور ثقافتی ادارے پہلے کے مقابلے میں زیادہ سیاسی نگرانی اور تنقید کا سامنا کر رہے ہیں۔

تاہم، مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ہر انتظامی اقدام کو مذہبی دشمنی سمجھنے کے بجائے اپنے اداروں کی کمزوریوں پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اگر کوئی مدرسہ قانونی طور پر رجسٹرڈ نہیں، وہاں بنیادی سہولیات موجود نہیں، مالی معاملات غیر شفاف ہیں یا طلبہ کو جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق تعلیم نہیں مل رہی تو ان خامیوں کو دور کرنا خود مسلم معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ حقوق کا مطالبہ اپنی جگہ، لیکن حقوق کے ساتھ ذمہ داریاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔

یہی پہلو نیپال کے مسلمانوں کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نیپال کی سیاسی اور آئینی صورتِ حال بھارت سے مختلف ہے، اس لیے بھارتی تجربے کو براہِ راست یہاں منطبق کرنا درست نہیں ہوگا۔ تاہم، ایک اصول عالمگیر ہے کہ کسی بھی کمیونٹی کے بنیادی مذہبی و تعلیمی ادارے جتنے زیادہ مضبوط، شفاف اور خود کفیل ہوں گے، وہ اتنے ہی کم سیاسی اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوں گے۔ اس لیے نیپال کے مسلمانوں کو اپنے مدارس، مساجد، ائمہ اور دیگر مذہبی اداروں کے معاملے میں حکومتی سرپرستی پر مکمل انحصار کرنے کے بجائے کمیونٹی کی مالی اور انتظامی صلاحیت بڑھانے پر توجہ دینی چاہیے۔

ائمہ کی تنخواہوں کے معاملے میں بھی یہی اصول قابلِ غور ہے۔ مذہبی رہنماؤں کی باعزت کفالت مسلم معاشرے کی اپنی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ مساجد کے مستقل فنڈ، وقف املاک، شفاف چندہ نظام اور باقاعدہ حساب کتاب کے ذریعے ایسا انتظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں امام کسی سیاسی جماعت یا حکومت کا محتاج نہ ہو۔ اس کا مطلب ریاست سے مکمل لاتعلقی نہیں، بلکہ مذہبی اداروں کی بنیادی خود مختاری کو مضبوط بنانا ہے۔ ریاست کا کام شہریوں کے حقوق کا تحفظ، قانون کی مساوی عمل داری اور ضروری سہولیات کی فراہمی ہے؛ کسی مذہبی ادارے کی مستقل بقا کی ذمہ داری بنیادی طور پر اسی معاشرے کو بھی اٹھانی چاہیے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔

مدارس کے بارے میں بھی دفاعی رویے کے بجائے اصلاحی سوچ کی ضرورت ہے۔ دینی تعلیم اپنی جگہ مسلم معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے، لیکن موجودہ دور میں مدرسے کے طالب علم کو زبان، ریاضی، سائنس، کمپیوٹر، شہری شعور اور روزگار کی بنیادی مہارتوں سے محروم رکھنا دانش مندی نہیں ہے۔ دینی علوم کے ساتھ جدید تعلیم کو شامل کرنے والا ایک مربوط تعلیمی ماڈل زیادہ مفید ہوگا، جس کے ذریعے مدرسے کا طالب علم اعلیٰ تعلیم، سرکاری ملازمت، کاروبار اور تحقیق کے میدان میں بھی آگے بڑھ سکے۔

اس طرح مدرسہ معاشرے سے الگ تھلگ ادارہ نہیں، بلکہ قومی تعلیمی نظام کا ایک باوقار حصہ بنتا ہے۔

نیپال کے مسلمانوں کے لیے اصل چیلنج یہ نہیں کہ وہ صرف خصوصی سہولیات حاصل کریں، بلکہ یہ ہے کہ وہ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی مؤثر شرکت یقینی بنائیں اور زیادہ سے زیادہ قومی دھارے کا حصہ بنیں۔ بہتر اسکول، معیاری مدارس، اعلیٰ تعلیم، خواتین کی تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت، کاروباری سرگرمیاں اور سرکاری و عوامی اداروں میں نمائندگی — یہ سب ایک مضبوط مسلم معاشرے کی بنیاد ہیں۔ قومی دھارے کا حصہ بننے کا مطلب اپنی مذہبی شناخت ترک کرنا نہیں، بلکہ اپنی شناخت کے ساتھ ایک ذمہ دار، تعلیم یافتہ اور فعال شہری بننا ہے۔

اس سلسلے میں مسلم قیادت کو بھی اپنے سیاسی بیانیے پر غور کرنا چاہیے۔ صرف یہ سوال کافی نہیں کہ حکومت مسلمانوں کے لیے کیا کر رہی ہے؛ یہ سوال بھی اہم ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی ترقی کے لیے خود کیا کر رہا ہے۔ اگر مدارس کو جدید بنانا ہے تو وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اگر ائمہ کو باعزت تنخواہ دینی ہے تو مستقل فنڈ کیسے قائم ہوگا؟ اگر غریب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینی ہے تو اسکالرشپ کا نظام کون قائم کرے گا؟ اگر مسلم اداروں کو غیر ضروری سیاسی مداخلت سے محفوظ رکھنا ہے تو ان کی انتظامی اور مالی خود کفالت کیسے پیدا ہوگی؟ ان سوالات کے عملی جواب کے بغیر صرف سیاسی احتجاج دیرپا حل فراہم نہیں کر سکتا۔

آخرکار ریاست اور اقلیت کے درمیان تعلق اعتماد، قانون اور مساوات پر قائم ہونا چاہیے۔ حکومتوں کو مذہبی شناخت سے قطع نظر قانون کا یکساں اطلاق کرنا چاہیے اور اقلیتوں کے آئینی حقوق کا احترام کرنا چاہیے۔ دوسری طرف اقلیتوں کو بھی اپنے اداروں کو قانون، شفافیت اور جدید تعلیمی تقاضوں کے مطابق مضبوط کرنا چاہیے۔ یہی متوازن راستہ کسی بھی جمہوری معاشرے کے لیے زیادہ صحت مند ہے۔

بھارت کے موجودہ تجربے سے نیپال کے مسلمانوں کے لیے شاید یہی سب سے اہم سبق نکلتا ہے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ریاست پر اعتماد ضروری ہے، لیکن اپنے اداروں کی بقا کے لیے صرف ریاست پر انحصار دانش مندی نہیں ہے۔ مضبوط مدرسہ، خود کفیل مسجد، باوقار امام، معیاری تعلیم اور قومی زندگی میں فعال شرکت — یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر ایک ایسا مسلم معاشرہ تعمیر ہو سکتا ہے جو نہ خوف میں مبتلا ہو اور نہ کسی سیاسی سرپرستی کا محتاج ہو۔

نیپال کے مسلمانوں کو اس مرحلے پر کسی دوسرے ملک کے سیاسی تجربے کی نقالی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس کے تجربات سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ بہتر راستہ یہی ہے کہ آئینی حقوق کا دفاع بھی ہو اور اداروں کی اصلاح بھی؛ حکومت سے تعاون بھی ہو، مگر غیر ضروری انحصار نہ ہو؛ مذہبی شناخت بھی محفوظ رہے اور قومی دھارے میں شرکت بھی بڑھتی جائے۔ مستقبل کی ضمانت سیاسی موسم نہیں، بلکہ مضبوط ادارے ہوتے ہیں۔ سیاست میں پارٹیاں آتی جاتی رہتی ہیں، اس لیے ہمیں مضبوط بنیادوں اور مستحکم اداروں کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیم انصاری
جھاپا نیپال

سیلاب اور مسلمانانِ نیپال کا جذبۂ اخوت

*_از: محمد عمران ندوی_*

قدرتی آفات جب آتی ہیں تو صرف گھر نہیں ڈھاتیں، بہت سے خواب بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔ خوش حال بستیوں میں اچانک خوف اتر آتا ہے، آباد گھرانے بے سروسامانی سے دوچار ہو جاتے ہیں اور زندگی کی رواں دواں گاڑی ایک لمحے میں رک سی جاتی ہے۔

نیپال کے ضلع رسوا، نوواکوٹ اور دیگر علاقوں میں آنے والے حالیہ سیلاب نے بھی ایسی ہی دردناک صورتِ حال پیدا کی، جس نے بے شمار خاندانوں کو آزمائش، بے یقینی اور مشکلات کے درمیان لا کھڑا کیا۔ کہیں گھر متاثر ہوئے، کہیں ضروری سامان بہہ گیا اور کہیں لوگوں کو اپنی زندگی دوبارہ سنوارنے کا کٹھن سفر درپیش ہو گیا۔

لیکن اس اندھیرے میں ایک ایسا روشن منظر بھی سامنے آیا جس نے دلوں کو امید سے بھر دیا: مسلمانانِ نیپال کا جذبۂ اخوت، ہمدردی اور ایثار۔

سیلاب کا پانی بستیوں میں تباہی کی داستان لکھ رہا تھا، مگر اسی دوران مسلمانوں کے دلوں میں محبت اور ہمدردی کے چراغ بھی روشن ہو رہے تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں سے لوگوں نے متاثرین کی خبر لی، ان کے لیے چندہ جمع کیا، اشیائے ضروریہ پہنچائیں اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کے دکھ میں شریک ہونے کی کوشش کی۔ کسی نے مال دیا، کسی نے سامان، کسی نے اپنا وقت اور محنت صرف کی، اور کسی نے دوسروں کو تعاون پر آمادہ کیا۔ ہاتھ مختلف تھے، وسائل مختلف تھے، مگر مقصد ایک تھا: مصیبت میں گھرے انسان کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔

یہی تو اخوت ہے کہ کسی کی آنکھ میں آنسو آئے تو دوسرے دل کو بھی بے چین کر دے؛ کسی کے گھر کا چراغ بجھے تو کوئی ہاتھ اسے دوبارہ روشن کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اس پورے منظرنامے میں مساجد اور مدارس کا کردار خاص طور پر قابلِ تحسین رہا۔ مساجد صرف عبادت گاہیں نہیں رہیں بلکہ درد مند دلوں کو جوڑنے کے مراکز بنیں، اور مدارس نے درس و تدریس کے ساتھ خدمتِ خلق کا عملی سبق بھی پیش کیا۔ ائمہ، علماء، طلبہ اور عام مسلمانوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق متاثرین کے لیے تعاون کیا۔ کسی طالب علم نے اپنی معمولی سی بچت پیش کر دی، کسی نے اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لیا، کسی صاحبِ خیر نے بڑی ذمہ داری سنبھالی اور کسی نے صرف ایک آواز بلند کی کہ: آیئے! اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہوں۔

بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں تھیں، لیکن جب اخلاص کے ساتھ اٹھنے والے ہاتھ ایک مقصد کے لیے مل جائیں تو معمولی قطرے بھی ایک مضبوط دریا بن جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی اصل طاقت کا اندازہ اس کے وسائل، عمارتوں اور خوش حالی سے نہیں، بلکہ مصیبت کے وقت اس کے دلوں کی دھڑکن سے ہوتا ہے۔ خوشی میں شریک ہونا آسان ہے، مگر کسی کے غم کو اپنا غم سمجھنا، کسی کے نقصان کو محسوس کرنا اور کسی پریشان حال خاندان کے لیے اپنے آرام میں کمی کرنا زندہ ضمیر کی علامت ہے۔

رسوا اور نوواکوٹ کے متاثرین کے لیے ہونے والا تعاون اسی زندہ احساس کا مظہر ہے۔ اس نے یہ پیغام دیا کہ نیپال کے مسلمان ایک دوسرے کے دکھ سے بے خبر نہیں؛ ان

کے دلوں میں درد ہے، ہاتھوں میں تعاون ہے اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے لیے کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی ہے۔

یہ تعاون صرف چند روپوں، چند تھیلوں یا چند امدادی سامان کا نام نہیں۔ اس کے پیچھے ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے: ملی شعور، اجتماعی ذمہ داری اور انسانیت کا احساس۔

کیونکہ معاشرہ صرف ان لوگوں سے نہیں بنتا جو ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں بانٹتے ہیں، بلکہ ان لوگوں سے بنتا ہے جو مشکل گھڑی میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ اگر کسی خاندان کا گھر متاثر ہوتا ہے تو اس کی تکلیف صرف اس گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رہنی چاہیے۔ اگر کسی بچے کی تعلیم متاثر ہوتی ہے تو معاشرے کے دوسرے افراد کو بھی اس کے مستقبل کی فکر ہونی چاہیے۔ یہی احساس افراد کو جوڑتا ہے اور ایک منتشر معاشرے کو ایک باہمی تعلق رکھنے والی جماعت میں تبدیل کرتا ہے۔

تاہم ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ سیلاب کا پانی اتر جانے سے مصیبت ختم نہیں ہوتی۔ پانی اتر جاتا ہے، مگر بہت سے گھروں میں خالی پن باقی رہ جاتا ہے؛ راستے کھل جاتے ہیں، مگر روزگار کے دروازے فوراً نہیں کھلتے؛ زندگی معمول کی طرف لوٹتی دکھائی دیتی ہے، مگر متاثرہ خاندانوں کے لیے ایک نئی زندگی شروع کرنا آسان نہیں ہوتا۔ تباہ شدہ گھروں کی تعمیر، روزگار کی بحالی، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور بچوں کی تعلیم جیسے مسائل طویل عرصے تک باقی رہ سکتے ہیں۔

اس لیے ہنگامی امداد کے ساتھ مستقل تعاون، منظم خدمت اور طویل مدتی منصوبہ بندی کی بھی ضرورت ہے۔ آج رسوا اور نوواکوٹ کے لیے بیدار ہونے والے جذبے کو وقتی جوش تک محدود رکھنے کے بجائے ایک مستقل اجتماعی روایت میں تبدیل کرنا ہوگا۔

یہ سانحہ ہمیں ایک اور خوب صورت سبق دیتا ہے: مدد کے لیے مال کی کثرت نہیں، دل کی وسعت ضروری ہے۔

کبھی ایک معمولی سی رقم، کبھی ایک تھیلا راشن، کبھی چند گھنٹوں کا وقت، کبھی ایک دعا اور کبھی صرف ایک مخلصانہ آواز بھی کسی پریشان حال انسان کے لیے امید کی کرن بن جاتی ہے۔ کسی کا تعاون چھوٹا نہیں ہوتا، اگر اس کے پیچھے اخلاص، محبت اور انسانیت کا جذبہ موجود ہو۔

آج رسوا اور نوواکوٹ ہماری توجہ کے محتاج ہیں، کل ممکن ہے کسی اور علاقے کو ہماری ضرورت پڑے۔ زندگی کا پہیہ ہمیشہ ایک سمت نہیں گھومتا۔ کبھی ہم کسی کا سہارا بنتے ہیں اور کبھی ہمیں کسی کے سہارے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لیے اخوت اور باہمی تعاون کو کسی ایک حادثے یا مخصوص وقت تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ خدمتِ خلق کو ہماری اجتماعی زندگی کی مستقل پہچان بنایا جائے۔ مساجد، مدارس، علماء، نوجوانوں اور اہلِ خیر کے درمیان ایسا مضبوط ربط قائم ہو جو ہر مشکل گھڑی میں انسانیت کے کام آ سکے۔ تاکہ جب بھی کسی بستی پر مصیبت اترے، جب بھی کسی گھر کا چراغ بجھنے لگے اور جب بھی کوئی خاندان بے سہارا ہو، تو اسے دور کہیں سے اٹھتی ہوئی ایک آواز سنائی دے: "تم اکیلے نہیں ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں!"

رسوا اور نوواکوٹ کا سیلاب بہت سے گھروں کے لیے آزمائش بن کر آیا، مگر اسی آزمائش نے مسلمانانِ نیپال کے جذبۂ اخوت، ایثار اور انسان دوستی کو تاریخ کے ایک روشن باب میں تبدیل کر دیا۔ مختلف علاقوں کے مسلمانوں نے جس یکجہتی، ہمدردی اور تعاون کا مظاہرہ کیا، وہ محض وقتی امداد نہیں بلکہ ایک ایسی تاریخ رقم کرنے کے مترادف ہے جسے آنے والی نسلوں کے لیے سنہرے حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ اس آزمائش نے ثابت کر دیا کہ اگر دلوں میں درد زندہ ہو، نیتوں میں اخلاص ہو اور ہاتھ ایک دوسرے کے لیے اٹھ جائیں تو محدود وسائل بھی بڑی امید بن سکتے ہیں۔ یہ صرف سیلاب زدگان کی مدد نہیں تھی؛ یہ اخوت کے پرچم کو بلند کرنے، انسانیت کے رشتے کو مضبوط کرنے اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو زندہ کرنے کا ایک روشن مظاہرہ تھا۔ آیئے! اس جذبے کو صرف ایک واقعے کی یاد نہ بننے دیں، بلکہ اسے ایک زندہ روایت بنائیں۔ اختلافات سے اوپر اٹھ کر، علاقے اور برادری کی حدوں سے آگے بڑھ کر، انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھیں۔ تاکہ آنے والے وقت میں کوئی مصیبت زدہ انسان خود کو تنہا محسوس نہ کرے۔

یہی اخوت کی حقیقی روح ہے، یہی ایثار کا حسن ہے، یہی انسانیت کی خوب صورتی ہے اور یہی ایک بیدار، مضبوط اور زندہ معاشرے کی پہچان ہے۔

اللہ تعالیٰ رسوا، نوواکوٹ اور دیگر متاثرہ علاقوں کے تمام خاندانوں کی مشکلات آسان فرمائے، ان کے نقصانات کا ازالہ فرمائے، بے گھر افراد کو دوبارہ اپنے گھروں کا سکون عطا فرمائے، ان کے روزگار اور معمولاتِ زندگی بحال فرمائے۔ جن لوگوں نے کسی بھی صورت میں متاثرین کی مدد کی ہے، ان کے مال، وقت، محنت اور اخلاص کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

Published By: Ulama Foundation Nepal, Bhairahwa, Rupandehi Lumbini Pradesh Nepal, Reg: 372860
Email:- weeklynepalurdutimes@gmail.com, Web site: www.nepalurdutimes.com, Contact:- +91 8795979383, +977 9817619786, +9779821442810

ہفت روزہ
نیپال اردو ٹائمز

Weekly The
NEPAL URDU TIMES
Reg.No: 5310 -2082/2083 - www.nepalurdutimes.com

مشرقِ وسطیٰ: عالمی طاقتوں کی شطرنج

✍ - مسعود محبوب خان (ممبئی)
۰۹۴۲۲۷۲۴۰۴۰

دنیا کے نقشے پر کچھ خطے ایسے ہوتے ہیں جو محض جغرافیہ نہیں ہوتے؛ وہ تاریخ کے دھارے، تہذیبوں کی سمت، عالمی معیشت کی رفتار اور بین الاقوامی سیاست کے مزاج پر اثر انداز ہونے والی قوت بن جاتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ بھی ایسا ہی ایک خطہ ہے۔ اسے اگر دنیا کا محض ایک جغرافیائی حصّہ سمجھا جائے تو شاید اس کی اصل اہمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خطہ صدیوں سے انسانی تہذیب، مذاہب، تجارت، توانائی اور عالمی طاقت کی کشمکش کا ایک ایسا سنگم ہے جہاں مقامی واقعات بہت جلد عالمی اثرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں پیدا ہونے والا بحران عموماً اپنی جغرافیائی حدود میں مقید نہیں رہتا۔ ایک سرحد پر اٹھنے والی آگ دوسری سرحدوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے، ایک سمندری راستے میں پیدا ہونے والی بے یقینی عالمی تجارت کو متاثر کر سکتی ہے، تیل کی قیمتوں میں معمولی سی بے چینی دنیا کی معیشتوں میں اضطراب پیدا کر سکتی ہے، اور ایک محدود جنگ بڑی طاقتوں کے مفادات کو اس طرح باہم متصادم کر سکتی ہے کہ پورا عالمی نظام دباؤ میں آ جاتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؛ یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دینے، بڑھانے یا روکنے میں کن قوتوں کے مفادات وابستہ ہیں؟ بین الاقوامی سیاست میں ریاستیں عموماً اپنے مفادات کو اخلاقی نعروں سے نہیں بلکہ طاقت، سلامتی، معیشت اور Strategic Priorities کے پیمانے سے ناپتی ہیں۔ چنانچہ ایک ہی واقعہ مختلف طاقتوں کے لیے مختلف معنی رکھتا ہے۔ کسی کے لیے وہ قومی سلامتی کا مسئلہ ہے، کسی کے لیے معاشی موقع، کسی کے لیے تزویراتی خطرہ اور کسی کے لیے عالمی اثر و رسوخ بڑھانے کا وسیلہ۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مشرقِ وسطیٰ کی پیچیدگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہاں بحران صرف مقامی فریقوں کے درمیان کشمکش کا نام نہیں رہتا؛ اس کے پیچھے علاقائی طاقتوں کے مفادات، عالمی طاقتوں کی ترجیحات، توانائی کی سیاست، اسلحے کی منڈیاں، تجارتی راستے اور عالمی سفارت کاری کی بساط بھی موجود ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس خطے کو بارہا ایسی کشمکشوں میں الجھایا گیا ہے جن کا کوئی فوری اختتام دکھائی نہیں دیتا۔ ایک بحران ختم ہونے سے پہلے دوسرا بحران سر اٹھاتا ہے، ایک محاذ سرد پڑتا ہے تو کسی دوسرے مقام پر تناؤ بڑھنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ امن ایک مستقل منزل کے بجائے ایک دور کا خواب محسوس ہونے لگتا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی اہمیت کا ایک بڑا سبب اس کا معاشی و توانائی کا کردار ہے۔ دنیا کی صنعتی معیشتیں توانائی کے مستحکم اور قابلِ اعتماد ذرائع کی محتاج ہیں۔ اس لیے خطے میں جنگ یا شدید سیاسی بے یقینی محض سفارتی مسئلہ نہیں رہتی بلکہ اس کے اثرات عالمی منڈیوں، تجارت، سرمایہ کاری، افراطِ زر اور عوامی زندگی تک پہنچتے ہیں۔ بحران کے وقت سوال صرف یہ نہیں ہوتا کہ جنگ کہاں ہو رہی ہے؛ سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا کی اشیا کہاں سے گزریں گی، توانائی کہاں سے آئے گی، اس کی قیمت کیا ہوگی اور عالمی تجارت کتنی محفوظ رہے گی؟ اسی لیے مشرقِ وسطیٰ میں پیدا ہونے والی بے یقینی کا ایک سرا واشنگٹن میں، دوسرا بیجنگ میں، تیسرا ماسکو میں اور ایک اور سرا نئی دہلی جیسے بڑے معاشی مراکز میں محسوس کیا جاتا ہے۔

چین اور روس سمیت عالمی طاقتیں مشرقِ وسطیٰ کے حالات کو محض دور بیٹھ کر دیکھنے والی قوتیں نہیں ہیں۔ دونوں کے اپنے معاشی، سیاسی اور Strategic مفادات ہیں۔ چین کے لیے یہ خطہ توانائی کی ضروریات، عالمی تجارت اور اپنے وسیع تر معاشی روابط کے اعتبار سے اہم ہے، جب کہ روس کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں موجودگی اس کے علاقائی اثر و رسوخ اور عالمی طاقت کے کردار سے جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ دونوں طاقتیں اس امر میں دلچسپی رکھتی ہیں کہ خطے میں پیدا ہونے والی کشیدگی کس سمت بڑھتی ہے، کون سی طاقت مضبوط ہوتی ہے، کون سی کمزور پڑتی ہے اور عالمی طاقت کا توازن کس طرح تبدیل ہوتا ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آتی ہے: مشرقِ وسطیٰ میں ہونے والی ہر جنگ دراصل طاقت کے عالمی توازن پر بھی ایک سوالیہ نشان ثبت کرتی ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی سیاست سے ہندوستان بھی الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ بھارت ایک بڑی آبادی، وسیع معیشت اور عالمی تجارت میں بڑھتے ہوئے کردار رکھنے والی ریاست ہے۔ اس کے معاشی مفادات، توانائی کی ضروریات، تجارتی روابط اور خطے سے وابستہ انسانی و معاشی تعلقات اسے مشرقِ وسطیٰ کے استحکام میں فطری دلچسپی رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی لیے بھارت کے لیے ایک ایسا مشرقِ وسطیٰ زیادہ مفید ہے جہاں کشیدگی موجود تو ہو مگر وہ ہمہ گیر جنگ میں تبدیل نہ ہو؛ جہاں تجارتی راستے محفوظ رہیں، توانائی کی فراہمی متاثر نہ ہو اور علاقائی عدمِ استحکام اس کی معیشت پر غیر معمولی بوجھ نہ ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی معیشتیں عموماً ایک مشکل توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں: وہ اپنے سفارتی و Strategic مفادات بھی محفوظ رکھنا چاہتی ہیں اور ایسی جنگ سے بھی بچنا چاہتی ہیں جو عالمی معیشت کے لیے ناقابلِ پیش گوئی بحران پیدا کر دے۔

اس پورے منظرنامے میں امریکہ کا کردار سب سے زیادہ پیچیدہ اور زیرِ بحث رہتا ہے۔ امریکی پالیسی کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ واشنگٹن کے لیے مشرقِ وسطیٰ صرف انسانی بحرانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ عالمی طاقت، علاقائی اتحاد، توانائی، دفاعی مفادات اور جغرافیائی سیاست کا اہم میدان بھی ہے۔ یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: کیا امریکہ کا مقصد صرف بحران کو ختم کرنا ہے یا بحران کے ذریعے اپنے تزویراتی مفادات کو بھی آگے بڑھانا؟ اس سوال کا جواب سادہ نہیں۔ امریکی پالیسی مختلف ادوار، صدور اور حالات میں تبدیل ہوتی رہی ہے۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ بڑی طاقتیں کسی بھی خطے میں اپنی موجودگی کو محض خیر خواہی کی بنیاد پر برقرار نہیں رکھتیں؛ اس کے پیچھے قومی مفادات اور عالمی طاقت کے تقاضے بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر کسی بحران کے ذریعے ایک طاقت اپنے حریفوں کو کمزور کر سکے، اپنے اتحادیوں کو اپنے قریب رکھ سکے، دفاعی صنعت کے مفادات کو آگے بڑھا سکے، علاقائی طاقت کے توازن کو اپنے حق میں برقرار رکھ سکے یا سفارتی دباؤ بڑھا سکے تو بحران اس کے لیے صرف مسئلہ نہیں رہتا؛ وہ طاقت کے استعمال اور مفاد کے حصول کا میدان بھی بن جاتا ہے۔ یہی بین الاقوامی سیاست کا وہ تلخ پہلو ہے جسے اخلاقی نعروں کے شور میں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

لیکن اس پوری بساط میں سب سے بنیادی سوال شاید یہ ہے کہ اس کھیل کی قیمت کون ادا کرتا ہے؟ بڑی طاقتیں اپنے سفارتی، معاشی اور تزویراتی مفادات کا حساب لگاتی ہیں؛ عالمی منڈیاں اتار چڑھاؤ کو اعداد و شمار میں ناپتی ہیں؛ دفاعی صنعتیں جنگ کو کاروباری امکانات میں تبدیل کرتی ہیں؛ حکومتیں قومی مفاد کے نام پر اپنے فیصلوں کا دفاع کرتی ہیں۔

مگر عام انسان؟

وہ اپنے گھر کا ملبہ دیکھتا ہے۔

وہ ہجرت کرتا ہے۔

وہ اپنے بچّوں کو کھوتا ہے۔

وہ روزگار سے محروم ہوتا ہے۔

وہ برسوں تک جنگ کے نفسیاتی اثرات برداشت کرتا ہے۔

اور کبھی کبھی وہ صرف اس لیے بے گھر ہو جاتا ہے کہ عالمی طاقتوں کی شطرنج پر اس کا وطن ایک اہم خانہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جغرافیہ انسانی المیے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

دنیا کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں مزید طاقت آزمائی کا ہر قدم لازماً کسی نہ کسی نئے ردِ عمل کو جنم دے سکتا ہے۔ جدید دنیا میں جنگ کی کوئی واضح جغرافیائی حد باقی نہیں رہی۔ میزائل ایک سرحد سے دوسری سرحد تک پہنچ سکتے ہیں، سائبر حملے براعظموں کے فاصلے مٹا سکتے ہیں، توانائی کا بحران پوری دنیا کو متاثر کر سکتا ہے اور ایک علاقائی تصادم عالمی سفارت کاری کو کئی برس پیچھے دھکیل سکتا ہے۔ اس لیے آج اصل دانش مندی یہ نہیں کہ کون زیادہ طاقتور ہے؛ اصل دانش مندی یہ ہے کہ کون اپنی طاقت کو استعمال کیے بغیر اپنے مفاد کا تحفظ کر سکتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کو مزید بحرانوں میں دھکیلنا کسی ایک ملک کے لیے مستقل فتح کا راستہ نہیں۔ جنگیں اکثر فاتح اور مفتوح کے درمیان لکیر تو کھینچ دیتی ہیں، مگر ان کے ملبے میں مستقبل کی کئی جنگوں کے بیج بھی چھوڑ جاتی ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کی سب سے بڑی ضرورت شاید کسی نئی طاقت کی بالادستی نہیں بلکہ ایک ایسے موقعِ علاقائی و عالمی نظم کی ہے جس میں اس خطے کے عوام کو محض بڑی طاقتوں کے مفادات کا ذریعہ نہ سمجھا جائے۔ یہ خطہ تیل کے کنوؤں، عسکری اڈوں، تجارتی راستوں اور تزویراتی نقشوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ انسانوں کا خطہ ہے؛ تہذیبوں کا خطہ ہے؛ تاریخ اور مذہب کی عظیم روایات کا خطہ ہے؛ کروڑوں انسانوں کے گھروں کا خطہ ہے۔ دنیا اگر مشرقِ وسطیٰ کو صرف مفادات کی شطرنج سمجھتی رہے گی تو بحران ختم ہونے کے بجائے شکلیں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اگر اسے ایک انسانی، سیاسی اور تہذیبی حقیقت کے طور پر دیکھا جائے تو شاید امن کے امکانات پیدا ہو سکیں۔ آخرکار مسئلہ یہ نہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں کون جیتتا ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ کیا مشرقِ وسطیٰ کو مسلسل جنگوں کا میدان بننے سے بچایا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اس خطے میں اٹھنے والی ہر چنگاری اب صرف مشرقِ وسطیٰ کی چنگاری نہیں رہتی۔ اس کی روشنی عالمی سیاست کے ایوانوں تک پہنچتی ہے، اس کا دھواں عالمی معیشت پر چھاتا ہے اور اس کی تپش دنیا کے دور دراز معاشروں تک محسوس کی جاتی ہے۔ اسی لیے مشرقِ وسطیٰ کا امن محض اس خطے کے لوگوں کی ضرورت نہیں؛ یہ پوری دنیا کے مستقبل کی ضرورت ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کا بحران محض چند ریاستوں کے درمیان سیاسی یا عسکری تنازع نہیں، بلکہ پوری اُمّتِ مسلمہ کے لیے ایک بڑا فکری، اخلاقی، انسانی اور سیاسی امتحان ہے۔ یہ خطہ جس نے صدیوں تک علم، تہذیب، عدل، اخوت اور انسانی تمدّن کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا، آج عالمی طاقتوں کی کشمکش، علاقائی رقابتوں، سیاسی مفادات اور مسلسل جنگوں کی زد میں ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں سب سے بھاری قیمت عام مسلمان اور بے گناہ انسان ادا کر رہے ہیں۔ اُمّتِ مسلمہ کو اس بحران کو محض جذبات کی نگاہ سے نہیں بلکہ بصیرت، حکمت اور ملی شعور کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ فلسطین ہو یا شام، یمن ہو یا لبنان، عراق ہو یا خطے کا کوئی اور ملک — ہر جگہ انسانی جان کی حرمت، قومی خود مختاری، انصاف اور امن کو بنیادی اصول بنانا ہوگا۔ کسی بڑی طاقت کی اندھی حمایت یا مخالفت کے بجائے اُمّت کی پالیسی کا مرکز حق، عدل اور انسانی جان کا تحفظ ہونا چاہیے۔ قرآن کا اصول واضح ہے: — "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں انصاف سے نہ ہٹائے"۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم دنیا اپنے منتشر وسائل، معاشی قوت، جغرافیائی اہمیت، انسانی سرمایہ اور سفارتی امکانات کو محض قومی مفادات کے محدود دائروں میں نہ دیکھے، بلکہ انہیں ایک وسیع ملی اور انسانی ذمّہ داری کے تناظر میں استعمال کرے۔ مسلم ممالک اگر باہمی اختلافات سے بلند ہو کر مشترکہ سفارتی حکمتِ عملی اختیار کریں، انسانی بحرانوں کے حل کے لیے مؤثر کردار ادا کریں، جنگ کے بجائے مذاکرات اور مصالحت کو ترجیح دیں اور عالمی طاقتوں کے ساتھ تعلقات میں اپنی اجتماعی قوت کو بروئے کار لائیں تو مشرقِ وسطیٰ کے مستقبل کی سمت تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اُمّتِ مسلمہ کو یہ حقیقت بھی سمجھنی ہوگی کہ صرف بیرونی طاقتوں کو موردِ الزام ٹھہرانا کافی نہیں۔ ہماری داخلی کمزوریاں، باہمی نزاعات، سیاسی تقسیم، معاشی انحصار، علمی پسماندگی اور اجتماعی حکمتِ عملی کا فقدان بھی ہماری کمزوریوں میں شامل ہیں۔

جب تک اُمّت اپنے اندر اتحاد، خود اعتمادی، علمی و معاشی خود کفالت اور دوراندیش قیادت پیدا نہیں کرتی، اس وقت تک عالمی طاقتوں کی شطرنج پر مسلم خطے محض مہرے بننے کے خطرے سے پوری طرح محفوظ نہیں ہو سکتے۔

اس لیے آج سب سے بڑا ملی تقاضا یہ ہے کہ ہم مشرقِ وسطیٰ کو صرف جنگوں کے نقشے پر نہ دیکھیں، بلکہ وہاں بسنے والے انسانوں کے دکھ کو محسوس کریں۔ ایک بچّے کا خوف، ایک ماں کی بے بسی، ایک خاندان کی ہجرت، ایک شہر کی تباہی اور ایک نسل کا مستقبل — یہ سب عالمی سیاست کے اعداد و شمار سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ مسلمان کی تکلیف صرف جغرافیائی فاصلے کی وجہ سے غیر متعلق نہیں ہو جاتی۔ اُمّت کا تصور ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں مظلوم انسان کی آہ ہمارے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے والی ہونی چاہیے۔

لیکن ملی ہمدردی کا تقاضا صرف جذباتی اظہار نہیں؛ اس کے ساتھ علم، تحقیق، منظم جدوجہد، انسانی خدمت، سفارتی کوشش، میڈیا کی ذمّہ داری اور فکری بیداری بھی ضروری ہے۔ ہمیں اپنی نئی نسل کو یہ سمجھانا ہوگا کہ عالمی سیاست نعروں سے نہیں، علم، معیشت، ٹیکنالوجی، سفارت کاری، اتحاد اور مضبوط اداروں سے متاثر ہوتی ہے۔ اگر اُمّت اپنے مستقبل کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہے تو اسے جذبات کے ساتھ حکمت، غیرت کے ساتھ بصیرت اور احتجاج کے ساتھ تعمیری عمل بھی پیدا کرنا ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ آج عالمی طاقتوں کے لیے شاید ایک شطرنج کی بساط ہو، لیکن اُمّتِ مسلمہ کے لیے یہ صرف ایک بساط نہیں؛ یہ ہماری تاریخ، تہذیب، مقدسات اور انسانی رشتوں کا حصّہ ہے۔ اس خطے کو مستقل جنگ، انتقام اور طاقت کی سیاست سے نکال کر امن، انصاف، خود مختاری اور انسانی وقار کی طرف لے جانا صرف وہاں کے عوام کی ذمّہ داری نہیں، بلکہ پوری عالمی برادری کی ذمّہ داری ہے اور مسلم دنیا کی تو اس میں خصوصی ذمّہ داری ہے۔ آخرکار دنیا کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کو طاقت کے کھیل کا میدان بنائے رکھنا چاہتی ہے یا انسانی امن کا مرکز بنانا چاہتی ہے۔ عالمی طاقتوں کی شطرنج میں مہرے بدلتے رہیں گے، اتحاد بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے، مفادات کی سمتیں تبدیل ہوتی رہیں گی؛ لیکن انسانی جان کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔

لہٰذا وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کو شطرنج کی بساط سے اٹھا کر انسانوں کے گھروں کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ یہاں کے عوام کو کسی طاقت کے مہرے نہیں، اپنے مستقبل کے مالک سمجھا جائے؛ جنگ کو سیاست کا واحد ذریعہ نہیں بلکہ آخری اور تباہ کن راستہ سمجھا جائے؛ اور عالمی تعلقات کو غلبے کے بجائے عدل، مفاد کے بجائے ذمّہ داری اور طاقت کے بجائے حکمت کے اصولوں پر استوار کیا جائے۔ کیونکہ امن صرف مشرقِ وسطیٰ کی ضرورت نہیں — امن مشرقِ وسطیٰ کے راستے پوری انسانیت کی ضرورت ہے۔ اور اگر دنیا نے اس حقیقت کو سمجھنے میں مزید تاخیر کی تو آج جو آگ ایک خطے میں بھڑک رہی ہے، کل اس کی لپٹیں کسی بھی سرحد کو محفوظ نہیں رہنے دیں گی۔

(۱۰،۰۹،۲۰۲۶)
Masood M. Khan (Mumbai)
masood.media4040@gmail.com

○○○○○○○○○

اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے

محمد علی شیر قادری نظامی
سکونت: روضہ شریف، مہوتری نیپال

اللہ سے ڈرتے رہو، کسی کی بے بسی کا مذاق نہ اڑاؤ

انسان جب کسی کو کمزور حالت میں دیکھتا ہے تو بسا اوقات اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ اسے اپنے مال پر غرور ہوتا ہے، اپنی صحت پر ناز ہوتا ہے، اپنی جوانی پر فخر ہوتا ہے، اپنی شہرت اور منصب پر تکبر آتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس کی اپنی کمائی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں۔ جس نے آج اسے صحت دی ہے، وہی صحت واپس لینے پر قادر ہے؛ جس نے آج اسے رزق کی فراوانی دی ہے، وہی رزق میں تنگی پیدا کرنے پر قادر ہے؛ جس نے اسے عزت دی ہے، وہی ایک لمحے میں اسے محتاجی اور بے بسی کی حالت میں لا سکتا ہے۔ تصوف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کی سب سے بڑی فتح دوسروں کو شکست دینا نہیں بلکہ اپنے نفس کو شکست دینا ہے۔ جب تک آدمی اپنے نفس کے غرور، انا، خود پسندی اور برتری کے احساس سے مغلوب رہتا ہے، وہ حقیقتِ بندگی سے دور رہتا ہے۔ لیکن جب زندگی کے کسی موڑ پر اس کا غرور ٹوٹتا ہے، اس کی خود ساختہ طاقت کا بھرم کھلتا ہے، اس کی بے بسی اس کے سامنے آتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں، تب اس کے اندر معرفت کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منسوب ایک نہایت معنی خیز قول ہے: "اپنے نفس کی شکست سے اپنے رب کو پہچان۔" اس مختصر جملے میں تصوف کی ایک پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ انسان جب تک اپنے نفس کو ہر حال میں درست، طاقتور اور برتر سمجھتا رہے، اسے اپنے رب کی قدرت کا حقیقی ادراک نہیں ہو پاتا۔ مگر جب نفس کی اکڑ ٹوٹتی ہے، جب انسان اپنی بے بسی کو پہچانتا ہے، جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صحت ہمیشہ اس کے اختیار میں ہے، نہ مال، نہ عزت، نہ زندگی اور نہ ہی اگلی سانس؛ تب اس کے اندر سے "میں" کا بت ٹوٹنے لگتا ہے اور "وہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ نفس کی شکست کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی عزتِ نفس کھو دے یا دنیاوی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے؛ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی بڑائی کا دعویٰ چھوڑ دے اور اپنی حقیقتِ بندگی کو پہچان لے۔ وہ سمجھ لے کہ میں محتاج ہوں اور میرا رب بے نیاز ہے؛ میں کمزور ہوں اور وہ طاقت کا سرچشمہ ہے؛ میں فانی ہوں اور وہ باقی ہے۔ یہی احساس انسان کو تکبر سے نکال کر عاجزی کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر جب یہی انسان کسی فقیر کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے نفس کی حقیقت یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر آج میرے پاس مال ہے تو یہ میرے رب کی عطا ہے، میری ذاتی بڑائی نہیں۔ جب وہ کسی بیمار کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی صحت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ کسی بے بس انسان کو دیکھتا ہے تو اسے اپنی طاقت کا عارضی ہونا یاد آتا ہے۔ یوں دوسروں کی آزمائش اس کے لیے تماشہ نہیں رہتی بلکہ اپنے نفس کی اصلاح کا آئینہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے کے بجائے اپنے نفس کی کمزوریوں پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کو میں آج کمزور سمجھ رہا ہوں، شاید وہ اپنے رب کے سامنے مجھ سے زیادہ مضبوط ہو۔ ممکن ہے اس کی غربت نے اسے اللہ کے قریب کر دیا ہو اور میری دولت نے مجھے اللہ سے دور کر دیا ہو۔ ممکن ہے اس کی بیماری اس کے لیے صبر اور اجر کا ذریعہ بن گئی ہو اور میری صحت میرے لیے غفلت کا سبب بن گئی ہو۔ اس لیے کسی کی غربت، بیماری یا بے بسی دیکھ کر اپنے آپ کو برتر سمجھنا دراصل اپنے نفس کے فریب میں مبتلا ہونا ہے۔ دانا انسان دوسرے کی آزمائش میں اپنے لیے سبق تلاش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "اے میرے رب! اگر یہ حالت میرے لیے لکھی گئی تو مجھے بھی صبر عطا فرمانا، اور اگر تو نے مجھے عافیت دی ہے تو مجھے اس عافیت پر غرور سے محفوظ رکھنا۔" انسان کی اصل تربیت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنی بے بسی کو پہچان لیتا ہے۔ کبھی بیماری انسان کو سکھاتی ہے کہ صحت کیا نعمت ہے، کبھی غربت رزق کی قدر سکھاتی ہے، کبھی تنہائی رشتوں کی حقیقت بتاتی ہے اور کبھی شکست انسان کو اپنی اصل طاقت یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ بسا اوقات جس مصیبت کو انسان اپنے لیے تباہی سمجھ رہا ہوتا ہے، وہی مصیبت اس کے نفس کی اصلاح اور رب کی معرفت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

پس اگر کسی کی حالت دیکھ کر دل میں تکبر پیدا ہو تو فوراً اپنے نفس سے پوچھنا چاہیے: "کیا مجھے یقین ہے کہ میں ہمیشہ اسی حالت میں رہوں گا؟" اگر جواب نفی میں ہو تو پھر غرور کیسا؟ اگر صحت دائمی نہیں، مال دائمی نہیں، جوانی دائمی نہیں، عہدہ دائمی نہیں اور زندگی بھی دائمی نہیں، تو پھر انسان کس بات پر اکڑے؟ بادشاہ کو فقیر اور تندرست کو بیمار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آج جس ہاتھ میں طاقت ہے، کل وہ کسی سہارے کا محتاج ہو سکتا ہے۔ آج جس گھر میں آسودگی ہے، کل وہاں فاقہ ہو سکتا ہے۔ آج جس شخص کے گرد لوگ جمع ہیں، کل وہ تنہائی میں بیٹھا ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے والا شخص کسی غریب کا مذاق نہیں اڑاتا، کسی بیمار کو حقیر نہیں سمجھتا اور کسی بے بس کو تماشہ نہیں بناتا۔

بلکہ وہ دوسروں کی آزمائش دیکھ کر اپنے رب کو یاد کرتا ہے، اپنے نفس کو جھکاتا ہے اور دل میں کہتا ہے: "اے اللہ! مجھے اپنی نعمتوں کا شکر عطا فرما، مجھے اپنے بندوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے کی توفیق دے اور میرے نفس کے غرور کو میری ہلاکت کا سبب نہ بنانا۔"

یہی نفس کی شکست کا حسن ہے کہ انسان دوسروں کو نیچا دکھانے کی خواہش سے آزاد [illegible] ضرورت نہیں رہتی کہ وہ بڑا ہے؛ اسے صرف یہ فکر رہتی ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو۔ وہ جان لیتا ہے کہ حقیقی بلندی کسی انسان کو دبانے میں نہیں بلکہ کسی گرے ہوئے کو اٹھانے میں ہے، کسی محتاج کی عزت رکھنے میں ہے، کسی بیمار کے لیے دعا کرنے میں ہے اور کسی بے بس کے ہاتھ کو تھام لینے میں ہے۔

لہٰذا جب کبھی زندگی میں اپنی طاقت پر غرور محسوس ہو، کسی کمزور پر ہنسی آئے یا کسی محتاج کو حقیر سمجھنے کا خیال دل میں پیدا ہو تو اپنے نفس کو روک کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ شاید یہی لمحہ ہمارے لیے معرفت کا لمحہ بن جائے؛ شاید یہی کسی دوسرے کی آزمائش ہمیں اپنی حقیقت دکھا دے؛ شاید کسی غریب کے چہرے پر لکھی ہوئی بے بسی ہمیں اپنی محتاجی کا احساس دلا دے؛ اور شاید کسی بیمار کی کراہ ہمارے اندر سوئے ہوئے دل کو بیدار کر دے۔ آخرکار بندہ جب اپنے نفس کی شکست کو قبول کرتا ہے تو اسے اپنے رب کی عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جب "میں" کا غرور کم ہوتا ہے تو "اللہ" کی معرفت بڑھتی ہے۔ جب اپنی طاقت کا بھرم ٹوٹتا ہے تو اللہ کی قدرت سامنے آتی ہے۔ جب انسان اپنی محتاجی کو پہچانتا ہے تو اپنے رب کی بے نیازی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لیے کسی کی بے بسی پر ہنسنے سے پہلے اپنے نفس کو دیکھو، کسی کی بیماری پر طنز کرنے سے پہلے اپنی صحت کو دیکھو، کسی کی غربت پر فخر کرنے سے پہلے اپنی دولت کے مالک کو پہچانو اور کسی کو حقیر سمجھنے سے پہلے اپنی حقیقت یاد کرو۔ ممکن ہے جسے تم آج کمزور سمجھ رہے ہو، اللہ کے نزدیک وہ تم سے کہیں بلند ہو۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منسوب اس قول کی گہرائی سمجھ آتی ہے: "اپنے نفس کی شکست سے اپنے رب کو پہچان۔" کیونکہ جس دن نفس کی اکڑ ٹوٹ جاتی ہے، اسی دن انسان کے اندر عاجزی جنم لیتی ہے؛ جس دن اپنی بے بسی کا ادراک ہو جاتا ہے، اسی دن اللہ کی قدرت کا شعور گہرا ہوتا ہے؛ اور جس دن بندہ اپنی حقیقتِ محتاجی پہچان لیتا ہے، اسی دن اسے اپنے رب کی بے نیازی اور عظمت کی پہلی حقیقی جھلک نصیب ہوتی ہے۔ پس اپنے نفس کو شکست دو، کسی انسان کو نہیں؛ اپنی انا کو جھکاؤ، کسی مجبور کو نہیں؛ اپنے تکبر کو ختم کرو، کسی غریب کی عزت کو نہیں۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک اصل فتح یہ نہیں کہ تم نے کسی دوسرے کو گرا دیا، بلکہ اصل فتح یہ ہے کہ تم نے اپنے اندر کے تکبر کو گرا دیا۔ اور یہی وہ فتح ہے جس کے بعد انسان مخلوق کو حقیر نہیں سمجھتا، بلکہ ہر چہرے میں اپنے رب کی مخلوق دیکھتا ہے، ہر آزمائش میں اپنے لیے سبق تلاش کرتا ہے اور ہر نعمت پر سرِ شکر خم کر دیتا ہے۔

۱۹۸۰ کی دہائی کا ٹرینڈ نہیں، ہمارا بچپن لوٹ آیا ہے

(آج لوگ جس دور کی تصویریں بنا رہے ہیں، ہم نے اُس زمانے کو اپنی آنکھوں سے جیا ہے)

از قلم: سید آصف امام کاکوی

وقت کبھی واپس نہیں آتا، لیکن کچھ زمانے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ برسوں بعد کوئی پرانا گیت کانوں میں پڑ جائے، کسی پرانی گلی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے، کسی بچھڑے ہوئے دوست کا نام سنائی دے یا بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد اچانک ذہن کے دروازے پر دستک دے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت نے پلٹ کر ہمیں آواز دی ہو۔ آج سوشل میڈیا پر ۱۹۸۰ کی دہائی کا ایک نیا ٹرینڈ نظر آرہا ہے۔ نوجوان اور بچے اُس زمانے کے لباس، انداز، بالوں، پرانی گاڑیوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلمی رنگ میں اپنی تصویریں بنوا رہے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے بھی لوگ خود کو اُس دور میں دیکھ رہے ہیں۔ نئی نسل کے لیے یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے، ایک خوبصورت یادِ ماضی ہے اور شاید ایک ایسا زمانہ جسے وہ تصویروں، فلموں اور بزرگوں کی باتوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے ۱۹۸۰ کی دہائی محض کوئی ''ٹرینڈ'' نہیں۔ ہم نے ۱۹۸۰ کی دہائی کو دیکھا نہیں، ہم نے اُسے جیا ہے۔

میرا جنم ۱۹۸۰ میں ہوا۔ اس لیے ۱۹۸۰ میرے لیے محض کیلنڈر کا ایک ہندسہ نہیں بلکہ میری زندگی کی ابتدا کا حوالہ ہے۔ وہ زمانہ میرے بچپن کا زمانہ ہے، میری پہلی یادوں کا زمانہ ہے، میرے گھر کے آنگن، میری گلیوں، میرے دوستوں، بزرگوں، شرارتوں، کھیلوں اور ماں کی آواز کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب کوئی ۱۹۸۰ کی دہائی کو ایک فیشن یا سوشل میڈیا ٹرینڈ کے طور پر پیش کرتا ہے تو میرے اندر خوشی کے ساتھ ایک عجیب سی اداسی بھی جاگ اٹھتی ہے۔ خوشی اس بات کی کہ نئی نسل ماضی کے اُس خوبصورت دور میں دلچسپی لے رہی ہے، اور اداسی اس بات کی کہ جس دنیا کو آج لوگ چند تصویروں میں تلاش کر رہے ہیں، وہ دنیا کبھی ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھی۔

میرا جنم ۱۹۸۰ میں ہوا۔ میری زندگی کی ابتدائی یادیں اسی دور کی گلیوں، گھروں،

رشتوں، دوستوں اور اُن چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے وابستہ ہیں جو آج شاید معمولی محسوس ہوں، مگر اُس وقت ہماری پوری دنیا ہوا کرتی تھیں۔ اور جب میں اپنے اُس بچپن کو یاد کرتا ہوں تو سب سے پہلے میرے ذہن میں کوئی فلمی منظر نہیں آتا۔ مجھے اپنا کاکو یاد آتا ہے۔ کاکو... جہاں میری یادوں نے آنکھ کھولی کاکو میرے لیے صرف نقشے پر موجود ایک بستی کا نام نہیں۔ کاکو میری شناخت ہے، میری مٹی ہے، میری یادوں کا پہلا گھر ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں میرے بچپن کے قدم پڑے، جہاں گلیوں نے مجھے چلنا سکھایا، جہاں بزرگوں کی آوازوں نے میرے کانوں میں زندگی کے پہلے سبق ڈالے اور جہاں مٹی میں کھیلتے ہوئے شاید ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہی مٹی ہماری سب سے قیمتی یاد بن جائے گی۔ کاکو کی وہ گلیاں آج بھی میرے ذہن میں آباد ہیں۔ گھروں کے دروازے، آنگن، راستے، کھلی زمینیں، درختوں کا سایہ، صبح کی آوازیں، شام کا اترتا ہوا سکون اور محلے کے لوگوں کی ایک دوسرے سے واقفیت یہ سب میری یادوں کا حصہ ہیں۔

تب کاکو صرف ایک جگہ نہیں تھا۔ وہ ایک مکمل دنیا تھی۔ ایسی دنیا جہاں کسی بچے کو اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی کا اپنا تھا۔ کسی کے گھر خوشی ہو تو خبر خود بخود پورے محلے تک پہنچ جاتی، کسی کے گھر غم ہو تو لوگ خود چل کر پہنچ جاتے۔ آج رابطے کے ہزاروں ذرائع ہیں۔

تب دل سے دل کا رابطہ تھا۔ آج کے بچے اپنے کھیلوں، دوستوں اور مصروفیات کے لیے موبائل، انٹرنیٹ اور آن لائن پلیٹ فارم کے محتاج ہیں۔ ہمارے بچپن میں نہ اسمارٹ فون تھا، نہ انٹرنیٹ، نہ سوشل میڈیا، نہ آن لائن گیمز۔ پھر بھی زندگی میں کھیل کی کمی نہیں تھی۔ گلی ہمارا میدان تھی، کھلا آسمان ہماری چھت، درخت ہمارا سایہ اور مٹی ہماری کھیل کی دنیا۔ کبھی کرکٹ، کبھی فٹبال، کبھی کنچے، کبھی پتنگ، کبھی گلی ڈنڈا، کبھی چھپن چھپائی۔ کھیل کا کوئی باقاعدہ منصوبہ نہیں ہوتا تھا۔ کسی دوست کو پیغام بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بس ایک بچہ دوسرے کے گھر پہنچتا اور آواز لگاتا چلو کھیلنے چلتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے سارے بچے جمع ہو جاتے۔

نہ کسی گروپ کی ضرورت تھی، نہ کسی دعوت نامے کی۔ دوستی خود دروازے پر آجاتی تھی۔ ماں کی آواز ہماری گھڑی تھی آج وقت معلوم کرنے کے لیے بچے موبائل دیکھتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں سورج کی روشنی، شام کی آہٹ اور ماں کی آواز ہماری گھڑی ہوا کرتی تھی۔ کھیلتے کھیلتے کب شام ہوئی، کب سورج ڈوبا، ہمیں خبر ہی نہ ہوتی۔ پھر کسی گھر سے آواز آتی بیٹا! گھر آ جاؤ۔ ہم جواب دیتے بس پانچ منٹ! وہ پانچ منٹ کبھی دس منٹ بن جاتے اور پھر دوسری آواز پہلے سے زیادہ سخت ہوتی کتنی بار بلاؤں؟ گھر آؤ!'' تب معلوم ہوتا کہ بچپن کی ایک اور شام گزر گئی۔ آج گھڑی، موبائل اور اسمارٹ واچ وقت بتاتے ہیں، مگر اُس زمانے میں ماں کی آواز میں جو محبت، فکر اور اپنائیت تھی، اُس کا کوئی متبادل نہیں۔ کم تصویریں تھیں، مگر ہر تصویر میں ایک پوری دنیا تھی آج موبائل فون میں ایک دن کی سینکڑوں تصویریں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں تصویر بنوانا بھی ایک خاص موقع ہوا کرتا تھا۔ کسی شادی میں کیمرہ آیا تو پورا خاندان ایک جگہ جمع ہو جاتا۔ ایک تصویر کے لیے سب تیار ہوتے۔ تصویر کھنچتی اور پھر اُس کے بن کر آنے کا انتظار ہوتا۔

آج تصویریں بے شمار ہیں، مگر اُنہیں دیکھنے کا وقت کم ہے۔ تب تصویریں کم تھیں، مگر ایک تصویر میں پورا خاندان سما جاتا تھا۔ دادا، دادی، والدین، چچا، پھوپھی، بہن بھائی اور کزنز سب ایک فریم میں۔ آج جب وہ پرانی تصویر سامنے آتی ہے تو صرف چہرے نظر نہیں آتے، ایک پورا زمانہ سامنے آجاتا ہے۔ اور کبھی تصویر میں موجود کوئی شخص دنیا سے رخصت ہو چکا ہو تو وہ تصویر اور بھی قیمتی ہو جاتی ہے۔ پھر تصویر، تصویر نہیں رہتی؛ یاد بن جاتی ہے۔ تب رابطے کم تھے، تعلق زیادہ تھا یہ بھی عجیب تبدیلی ہے کہ آج انسان کے پاس رابطے کے ہزاروں ذرائع ہیں، مگر کبھی کبھی حقیقی تعلق کم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

ہمارے پاس نہ Facebook تھا، نہ WhatsApp، نہ Instagram۔ مگر دوستیاں تھیں، ملاقاتیں تھیں، بیٹھکیں تھیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا جذبہ تھا۔

کسی کے گھر خوشی ہو تو پورا محلہ شریک ہوتا تھا۔

کسی کے گھر غم ہو تو لوگ صرف تعزیتی پیغام نہیں بھیجتے تھے، دروازے پر پہنچتے تھے۔ تب کسی پڑوسی کا حال معلوم کرنے کے لیے ''آن لائن'' آنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا تھا اور حال پوچھ لیا جاتا تھا۔ شادیوں میں دولت کم، اپنائیت زیادہ تھی ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب شادی صرف دو افراد یا دو خاندانوں کا معاملہ نہیں بلکہ پورے محلے کی خوشی ہوا کرتی تھی۔ گھروں میں کئی کئی دن پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ رشتہ دار آکر قیام کرتے۔ خواتین مل کر کام کرتیں۔ بچے نئی پوشاک پہن کر خوشی سے ادھر اُدھر گھومتے۔ گھر شاید آج کے مقابلے میں چھوٹے تھے، مگر دل بڑے تھے۔ وسائل محدود تھے، مگر خوشیاں محدود نہیں تھیں۔ آج شادیوں میں روشنی زیادہ ہے، آرائش زیادہ ہے، تصویریں زیادہ ہیں، لیکن کبھی کبھی دل یہ سوال ضرور کرتا ہے کہ کیا وہ بے تکلف اپنائیت بھی اتنی ہی باقی ہے؟ ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائی کے گھروں میں بزرگ صرف عمر میں بڑے افراد نہیں تھے، وہ تجربے اور روایت کا خزانہ ہوا کرتے تھے۔ دادا دادی کے قصے، نانا نانی کی کہانیاں، والدین کی نصیحتیں اور محلے کے بزرگوں کی دعائیں ہماری تربیت کا حصہ تھیں۔ ہم نے اپنے خاندان کی تاریخ صرف کاغذ پر نہیں پڑھی، اسے بزرگوں کی زبان سے سنا۔ ہمیں معلوم تھا کہ کون کس کا رشتہ دار ہے، کس کے گھر میں کیا خوشی ہوئی، کس نے کس مشکل میں ساتھ دیا۔ آج خاندان کا شجرہ کمپیوٹر پر بنایا جاسکتا ہے، مگر اُس زمانے میں خاندان دلوں میں آباد تھا۔ ہم وہ نسل ہیں جس نے دنیا کو بدلتے ہوئے دیکھا ہماری نسل کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ہم نے تبدیلی کو صرف کتابوں میں نہیں پڑھا بلکہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا ہے۔ ہم نے خط کا زمانہ دیکھا، ڈاکیے کا انتظار دیکھا، ٹرنک کال کا انتظار دیکھا، لینڈ لائن فون دیکھا، پھر موبائل فون دیکھا، ایس ایم ایس سے لے کر ویڈیو کال تک کا سفر دیکھا۔ ہم نے بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن دیکھا، پھر رنگین ٹی وی آیا۔ کیسٹ سے سی ڈی تک اور سی ڈی سے ڈیجیٹل موسیقی تک کا سفر دیکھا۔ ہم نے کمپیوٹر کو نئی چیز کے طور پر دیکھا اور آج مصنوعی ذہانت کو اپنی زندگی کا حصہ بنتے دیکھ رہے ہیں۔ ہماری نسل نے ٹیکنالوجی سے پہلے کی زندگی بھی دیکھی اور ٹیکنالوجی کے انقلاب کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ یہ ہماری نسل کا ایک تاریخی تجربہ ہے۔ آج ایک کلک پر دنیا بھر کی موسیقی دستیاب ہے۔ ہمارے زمانے میں کسی پسندیدہ گیت کو سننے کے لیے کیسٹ کا انتظار ہوتا تھا۔ کیسٹ کی ٹیپ خراب ہو جائے تو اسے قلم یا پنسل سے احتیاط کے ساتھ گھمایا جاتا تھا۔ ایک گانا پسند آتا تو بار بار سنا جاتا۔ شاید گانے کم تھے، لیکن ہر گانے کے ساتھ ایک یاد جڑی ہوتی تھی۔

موسیقی بہت زیادہ ہے، مگر بعض اوقات دل اب بھی وہی پرانا گیت تلاش کرتا ہے جس میں بچپن کی کوئی شام چھپی ہوئی ہو۔ آج مصنوعی ذہانت ایسی تصویریں بنا سکتی ہے جن میں انسان خود کو ۱۹۸۰ کی دہائی میں دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ایک بات شاید کوئی ٹیکنالوجی کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ حقیقی یاد واپس نہیں لا سکتی۔ AI ایک پرانی گلی کی تصویر بنا سکتی ہے، مگر اُس میں دوڑتے ہوئے بچے کی خوشی نہیں بنا سکتی۔ وہ گھر کا آنگن بنا سکتی ہے، مگر اُس آنگن میں بیٹھے بزرگوں کی محبت واپس نہیں لا سکتی۔ وہ ماں کا چہرہ بنا سکتی ہے، مگر ماں کی آواز میں چھپی ہوئی وہ محبت دوبارہ پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ دوستوں کی تصویر بنا سکتی ہے، مگر اُن دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا وہ وقت واپس نہیں لا سکتی۔ تصویر مصنوعی ہو سکتی ہے، یاد مصنوعی نہیں ہو سکتی۔ شاید پرانی یادوں کا سب سے دردناک پہلو یہی ہے کہ وقت صرف چیزیں نہیں بدلتا، لوگ بھی بدلتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کئی چہرے جو کبھی روزانہ نظر آتے تھے، آج صرف یادوں میں ہیں۔ کئی آوازیں جو کبھی گھر میں گونجتی تھیں، آج خاموشی میں سنائی دیتی ہیں۔ کئی دوست جن کے ساتھ گلیوں میں کھیلتے تھے، آج زندگی کی مصروف راہوں میں کہیں دور ہیں۔ اور کئی ایسے بھی ہیں جو اس دنیا میں نہیں رہے۔ اسی لیے جب ۱۹۸۰ کی دہائی کا کوئی پرانا گیت بجتا ہے تو صرف کان نہیں سنتے دل سنتا ہے۔ پرانی تصویر سامنے آتی ہے تو صرف چہرہ نہیں دکھائی دیتا پورا زمانہ سامنے آجاتا ہے۔ ہمیں نئی نسل سے کوئی شکایت نہیں۔ آج کے بچے ہم سے کہیں زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ اُن کے پاس علم کے وسیع ذرائع ہیں، دنیا اُن کی انگلیوں پر ہے اور ٹیکنالوجی اُن کے لیے نئے امکانات کے دروازے کھول رہی ہے۔ ہمیں ترقی کو روکنا نہیں، بلکہ ترقی کے ساتھ اپنے انسانی رشتوں کو بھی زندہ رکھنا ہے۔ موبائل ضرور استعمال کریں، مگر کتاب بھی پڑھیں۔ انٹرنیٹ ضرور استعمال کریں، مگر بزرگوں کے پاس بیٹھنے کا وقت بھی نکالیں۔ آن لائن دوست ضرور بنائیں، مگر اپنے پڑوس کے بچوں کو بھی دوست بنائیں۔ تصویریں ضرور بنائیں، مگر کچھ لمحے ایسے بھی گزاریں جنھیں کیمرے کے بغیر صرف دل میں محفوظ کیا جاسکے۔ کیونکہ زندگی کی سب سے خوبصورت یادیں اکثر وہی ہوتی ہیں جن کی کوئی تصویر نہیں ہوتی۔

۱۹۸۰ میرے لیے صرف ایک سال نہیں

آج لوگ ۱۹۸۰ کی دہائی کو ایک ٹرینڈ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ کوئی اسے فیشن کہتا ہے، کوئی ریٹرو انداز اور کوئی ماضی کی یاد۔ یہ سب اپنی جگہ خوبصورت ہے۔ لیکن میرے لیے ۱۹۸۰ کی دہائی میرا بچپن ہے۔ میری گلی ہے۔ میرا گھر ہے۔ میرا آنگن ہے۔ میرے دوست ہیں۔ میرے بزرگ ہیں۔ میری شرارتیں ہیں۔ ماں کی آواز ہے۔ والد کی شفقت ہے۔ مٹی کی خوشبو ہے۔ وہ بے فکری ہے جس میں وقت تیز نہیں، زندگی خوبصورت لگتی تھی۔ ہم نے ۱۹۸۰ دیکھا، ۱۹۹۰ دیکھا، ۲۰۰۰ دیکھا اور آج ۲۰۲۶ بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے خط سے موبائل تک، ریڈیو سے اسمارٹ فون تک، کیسٹ سے ڈیجیٹل موسیقی تک اور سادہ تصویروں سے مصنوعی ذہانت تک کا سفر دیکھا ہے۔

ہم نے دنیا کو بدلتے دیکھا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں دنیا کی کوئی ترقی تبدیل نہیں کر سکتی۔

ماں کی محبت۔ باپ کا سایہ۔ دوست کی سچی رفاقت۔ بزرگوں کی دعا۔ بچپن کی بے فکری۔ اور یادوں کی وہ خوشبو جو برسوں بعد بھی دل کو چھو جاتی ہے۔ اس لیے اگلی بار جب ۱۹۸۰ کی دہائی کی کوئی تصویر آپ کے سامنے آئے تو اسے صرف ایک ''ٹرینڈ'' سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے۔ ہوسکتا ہے کسی کے لیے وہ ایک فیشن ہو کسی کے لیے ایک خوبصورت تجربہ لیکن کسی کے لیے وہ پوری زندگی ہو۔ اور میرے لیے؟ ۱۹۸۰ کوئی ٹرینڈ نہیں۔

۱۹۸۰ میری پیدائش ہے۔ میری یاد ہے۔

میرا بچپن ہے۔ میری مٹی ہے۔ میری دنیا ہے۔ میری کہانی ہے۔ وقت گزر گیا، لوگ بدل گئے، گلیاں بدل گئیں، گھر بدل گئے، دنیا بدل گئی مگر دل کے کسی کونے میں آج بھی ایک بچہ کھیل رہا ہے۔ وہی بچہ جو شام تک گلی میں کھیلتا تھا، ماں کی آواز پر گھر لوٹتا تھا اور اگلے دن پھر اسی بے فکری کے ساتھ دوستوں کے درمیان پہنچ جاتا تھا۔ شاید اسی لیے ۱۹۸۰ کی دہائی آج ہمارے سامنے ٹرینڈ بن کر لوٹ آئی ہے۔ مگر ہمارے لیے یہ ٹرینڈ نہیں ہمارا بچپن لوٹ آیا ہے۔

بھاگوت کے بیانیے اور ایجنڈے میں تضاد

از قلم: ڈاکٹر سید تابش امام

آر ایس ایس سربراہ موہن بھاگوت نے گزشتہ دنوں اپنے دورۂ امریکہ کے دوران مسلمانوں کے حوالے سے جو نسبتاً نرم اور حقیقت پسندانہ لہجہ اختیار کیا، وہ بظاہر ایک مثبت تبدیلی کا اشارہ محسوس ہوتا ہے۔ تاہم، اگر اس بیان کو آر ایس ایس کے دیرینہ نظریاتی موقف اور گزشتہ چند برسوں کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بیانیہ حقیقت پسندانہ کم اور مصلحت پسندانہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے بارے میں بھاگوت کی سوچ واقعی تبدیل ہوئی ہے تو پھر آر ایس ایس کے نظریاتی دائرے میں سرگرم تنظیموں اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے خلاف اختیار کیے جانے والے رویوں میں اس تبدیلی کی جھلک کیوں دکھائی نہیں دیتی؟

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آر ایس ایس کی تشکیل اور اس کے نظریاتی سفر پر ہندو قوم پرستی کا گہرا اثر رہا ہے۔ اس نظریے کے تحت ہندوستان کی تہذیبی شناخت کو ایک مخصوص اکثریتی تصور سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ وقت کے ساتھ اس نظریے کو قوم پرستی، ثقافتی احیا اور قومی یکجہتی جیسے تصورات کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا، لیکن اس کے ناقدین کا ہمیشہ یہ اعتراض رہا ہے کہ اس تصور میں ہندوستان کی کثیر مذہبی، کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی حقیقت کے لیے مطلوبہ وسعت موجود نہیں ہے۔

آر ایس ایس کے زیرِ اثر یا اس سے نظریاتی قربت رکھنے والی متعدد تنظیمیں ملک کے مختلف حصوں میں سرگرم ہیں۔ ان میں سے بعض تنظیموں پر مسلم مخالف بیان بازی اور سرگرمیوں کے الزامات بھی عائد ہوتے رہے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران ملک کے مختلف حصوں سے مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز تقاریر، مذہبی مقامات سے متعلق تنازعات، مساجد و مدارس پر سوالات، معاشی بائیکاٹ کی اپیلوں اور مسلمانوں کی املاک کے خلاف کارروائیوں کی خبریں سامنے آتی رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں آر ایس ایس سربراہ کا مسلمانوں کے بارے میں نسبتاً مفاہمت آمیز بیان یقیناً توجہ کا مرکز بنتا ہے، مگر محض بیانات سے نظریاتی تبدیلی ثابت نہیں ہوتی؛ اس کے لیے زمینی سطح پر عملی تبدیلی بھی نمایاں ہونا ضروری ہے۔

بھاگوت کے حالیہ بیانیے کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی ترقی اور قومی یکجہتی کے لیے مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا ناگزیر ہے تو یہ ایک خوش آئند احساس ہے۔ لیکن پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اس سوچ کا اطلاق ان تمام حلقوں پر کیوں نہیں ہوتا جو اکثریتی جذبات کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں؟ کیا آر ایس ایس اور اس سے نظریاتی وابستگی رکھنے والی تنظیمیں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے والی زبان اور طرزِ عمل سے واضح طور پر لاتعلقی اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں؟

مرکز میں اقتدار کی تبدیلی کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں مذہبی شناخت سے متعلق تنازعات میں جو اضافہ محسوس کیا گیا، اس نے ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری کردار کے بارے میں سنجیدہ سوالات کھڑے کیے ہیں۔ بعض ریاستوں میں مذہبی مقامات، حجاب، حلال، لاؤڈ اسپیکر، بین مذہبی شادیوں اور مسلمانوں کی آبادی یا املاک سے متعلق معاملات سیاسی مباحث کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ بعض مواقع پر ریاستی انتظامیہ کی کارروائیوں کو بھی مسلم مخالف زاویے سے دیکھا گیا۔ ایسے میں حکومتوں اور حکمراں جماعتوں کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ قانون کے نفاذ میں مذہب، ذات یا برادری کی بنیاد پر کسی امتیاز کا تاثر پیدا نہ ہونے دیں۔

حالیہ واقعات اس تشویش کو مزید تقویت دیتے ہیں۔ سہارنپور میں قدیم مسجد کی مسماری ہو یا آسام میں مسلمانوں کے مکانات کے خلاف انہدامی کارروائی، اگر انتظامی فیصلے قانونی ضابطوں کے تحت کیے گئے ہوں، تب بھی ان کی شفافیت، یکساں معیار اور متاثرہ شہریوں کے حقوق کا تحفظ بنیادی سوال بن جاتا ہے۔ آسام میں زرعی زمین پر تعمیرات اور زمین کے استعمال سے متعلق ضابطوں کی خلاف ورزی کے نام پر ۵۰ سے زائد مکانات منہدم کیے جانے کے واقعات پر بھی یہ سوال اٹھا کہ کیا قانون کا اطلاق سب پر یکساں طور پر ہوا؟ اسی طرح سہارنپور کے معاملے میں بھی مذہبی مقام سے متعلق انتظامی کارروائی نے اقلیتی برادری میں پیدا ہونے والے عدم تحفظ کے احساس کو نظر انداز کرنا مشکل بنا دیا ہے۔ جمہوریت میں کسی بھی حکومت یا انتظامیہ کو قانون کی خلاف ورزی کے خلاف کارروائی کا حق حاصل ہے، لیکن قانون کی حکمرانی کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ اگر ایک ہی نوعیت کی خلاف ورزی پر مختلف طبقات کے لیے مختلف پیمانے اختیار کیے جائیں تو کارروائی قانونی ہونے کے باوجود اس کی غیر جانب داری پر سوال اٹھنا فطری ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں موہن بھاگوت کے بیانیے اور زمینی صورتِ حال کے درمیان تضاد نمایاں ہوتا ہے۔

آر ایس ایس سربراہ اگر امریکہ میں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کے قومی دھارے کا حصہ سمجھنا چاہیے، ان کے ساتھ مل کر ملک کی تعمیر کرنی چاہیے اور انہیں شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے تو ہندوستان کے اندر بھی اسی پیغام کی عملی ترجمانی ہونی چاہیے۔ بیرونِ ملک دیا گیا مفاہمت کا پیغام اسی وقت قابلِ اعتبار ہوگا جب ملک کے اندر بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہمات، اشتعال انگیز بیان بازی اور امتیازی رویوں کے خلاف واضح موقف سامنے آئے۔ محض ایک مثبت بیان، اس وقت تک پائیدار اعتماد پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس کے اثرات زمینی سطح پر بھی محسوس نہ ہوں۔

یہاں ایک اور پہلو بھی اہم ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں ہندوستان کی شبیہ، جمہوری اقدار اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق سوالات عالمی سطح پر زیرِ بحث رہتے ہیں۔ ہندوستان کی اقتصادی ترقی، عالمی سفارت کاری اور بین الاقوامی اثر و رسوخ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک ایسے جمہوری معاشرے کے طور پر دیکھا جائے جہاں مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے ماننے والوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل ہوں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے بارے میں نرم اور متوازن زبان اختیار کرنا یقیناً سفارتی اور سیاسی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمان یہ دیکھنا چاہیں گے کہ یہ زبان محض عالمی سامعین کے لیے ہے یا واقعی اندرونِ ملک پالیسی اور رویوں میں بھی اس کا عکس نظر آئے گا۔

ہندوستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس ملک کی طاقت اس کی مذہبی اور ثقافتی گونا گونی میں رہی ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ، جین اور دیگر مذاہب کے ماننے والے صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بھی مختلف مذہبی برادریوں نے مشترکہ طور پر حصہ لیا۔ آئین نے اسی مشترکہ ورثے کو شہری مساوات، مذہبی آزادی اور انصاف کے اصولوں کے ذریعے تحفظ فراہم کیا ہے۔ اس لیے کسی بھی نظریے یا سیاسی منصوبے کو آئینی اقدار سے بالاتر نہیں رکھا جا سکتا۔

اصل مسئلہ کسی ایک بیان یا کسی ایک شخصیت کا نہیں بلکہ اس نظریاتی ماحول کا ہے جس میں مذہبی شناخت کو سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرنے کا رجحان مضبوط ہوا ہے۔ مضبوط، پُرامن اور ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر کے لیے لازم ہے کہ نفرت کی سیاست کے بجائے اعتماد کی سیاست کو فروغ دیا جائے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو رعایت نہیں، مساوی شہری حقوق درکار ہیں؛ ہمدردی نہیں، آئینی تحفظ چاہیے؛ اور محض بیانات نہیں، عملی انصاف چاہیے۔ اسی اصول پر ملک کے ہر شہری کو بلاامتیاز اپنی شناخت، عقیدے اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

موہن بھاگوت کا تازہ بیانیہ اسی لیے اہم ہے کہ وہ ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان عدم تحفظ اور سیاسی بے اعتمادی کے احساس پر مسلسل بحث ہو رہی ہے۔ ایسے ماحول میں آر ایس ایس جیسی بااثر تنظیم کے سربراہ کی جانب سے مسلمانوں کے حوالے سے اختیار کیا جانے والا لہجہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بیانیہ ہندوستان واپس آنے کے بعد کس حد تک عملی سیاست اور سماجی رویوں میں تبدیل ہوتا ہے۔

اگر یہ تبدیلی واقعی دل سے ہے تو اس کے اثرات سب سے پہلے ان لوگوں پر نظر آنے چاہئیں جو آر ایس ایس اور اس کے وسیع نظریاتی حلقے سے وابستہ ہیں۔ نفرت انگیز مہمات اور مسلم مخالف بیان بازی کے خلاف واضح اور دوٹوک موقف اس تبدیلی کا پہلا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ سوال برقرار رہے گا کہ بھاگوت کا نیا بیانیہ نظریاتی تبدیلی کا اعلان ہے یا بدلتے ہوئے عالمی ماحول میں اختیار کی گئی ایک مصلحت پسندانہ زبان۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو الفاظ سے زیادہ عمل پر یقین ہوگا۔ کیونکہ جمہوریت میں کسی تنظیم یا رہنما کی نیت کا سب سے معتبر پیمانہ اس کے الفاظ نہیں، بلکہ ان الفاظ کے بعد اٹھائے جانے والے عملی قدم ہوتے ہیں۔ بھاگوت کے موجودہ بیانیے کی اصل آزمائش بھی یہی ہے کہ کیا یہ الفاظ ہندوستان کے سماجی اور سیاسی ماحول میں اعتماد، مساوات اور آئینی انصاف کی صورت میں تبدیل ہوتے ہیں یا محض ایک خوش نما بیان بن کر رہ جاتے ہیں۔

رابطہ۔ ۹۹۳۴۹۳۳۹۹۲

نازا (NAZA) کی گواہی، حق کی آواز

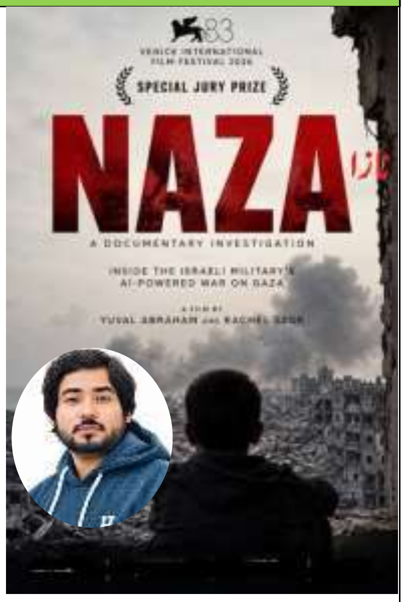

غزہ کے ملبے پر ایک سوال: دنیا کب جاگے گی؟

لباس کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، اگر ضمیر مر جائے تو انسان کی اصل قیمت باقی نہیں رہتی۔ اور جب ظلم انسانیت کی حدوں کو پامال کرنے لگے، تو خاموش رہنا بھی ضمیر کے لیے ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ غزہ آج تمہارے زندہ ضمیر سے ایک سوال کر رہا ہے: کیا تم واقعی اس درد کو محسوس کر رہے ہو؟

فلسطین میں جاری خونریزی اب کسی ایک دن، ایک ہفتے یا ایک مہینے کی داستان نہیں رہی۔ فلسطینی وزارتِ صحت کے مطابق، ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ سے ۱۵ ستمبر ۲۰۲۶ تک غزہ میں کم از کم ۷۸۹،۳۷ فلسطینی شہید اور ۷۹۸،۱۷۴ زخمی ہو چکے ہیں۔ یہ تازہ اعداد قطر کی سرکاری خبر رساں ایجنسی - QNA - نے ۱۵ ستمبر ۲۰۲۶ کو فلسطینی طبی ذرائع کے حوالے سے رپورٹ کیے ہیں۔ لیکن یہ اعداد اس درد کی مکمل تصویر نہیں۔

کیونکہ غزہ میں ایسے بھی بے شمار انسان ہیں جن تک امدادی اور طبی ٹیمیں اب تک پہنچ نہیں سکیں۔ کچھ لاشیں ملبے تلے دبی ہیں، کچھ علاقوں تک رسائی ممکن نہیں، اور کچھ جسم ایسے بھی ہیں جنہیں بارود کے دھماکوں نے اس طرح بکھیر دیا کہ انسان کی شناخت تک مٹ گئی - اس لیے آج جو تعداد ہمارے سامنے ہے، وہ صرف ان لوگوں کی ہے جن کی ہلاکت کی اطلاع مل سکی ہے۔ غزہ کے ملبے تلے دبے ہر شخص کا ابھی مکمل حساب نہیں ہو سکا۔

سوچیے، ان ملبوں کے نیچے کتنی مائیں اپنے بچوں کے ساتھ، کتنے بچے اپنے والدین کے ساتھ، کتنی بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ اور کتنے شوہر اپنی بیویوں کے ساتھ شاید ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے ہیں۔

غزہ میں بعض خاندانوں کے افراد کئی مہینوں بلکہ برسوں بعد ملبے سے مل رہے ہیں۔ اس لیے ۷۸۹،۳۷ صرف ایک تعداد نہیں، بلکہ ہزاروں انسانوں، خاندانوں اور زندگیوں کی کہانی ہے۔ اور ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اب بھی ملبے تلے دبے ہوں۔

مگر اسی اندوہناک منظرنامے کے درمیان ایک ایسی آواز بھی سامنے آئی ہے جسے نظر انداز کرنا آسان نہیں—اور وہ آواز باہر سے نہیں، بلکہ اسی معاشرے کے اندر سے اٹھ رہی ہے جہاں سے غزہ میں فلسطینیوں کے خلاف جاری تباہی اور مبینہ نسل کشی پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

حال ہی میں یُووال ابراہام (Yuval Abraham) اور ریچل سور (Rachel Szor) کی فلم "نازا (NAZA) نے وینس فلم فیسٹیول میں عالمی توجہ حاصل کی

اس فلم میں ۲۴ اسرائیلی فوجی اور انٹیلی جنس اہلکاروں کی گمنام گواہیوں کے ذریعے غزہ میں شہری ہلاکتوں کے بارے میں سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

NAZA ایک اسرائیلی فوجی اصطلاح ہے- بہت آسان الفاظ میں سمجھیں تو "نازا" جو کسی فضائی حملے میں متوقع شہری ہلاکتوں کی تعداد بتانے کے لئے بولا جانیوالا الفاظ ہے یعنی حملہ کرنے سے پہلے یہ اندازہ لگانا کہ اس حملے میں کتنے عام شہری مارے جاسکتے ہیں۔

فلم میں کچھ ایسے لوگوں کی گواہیاں شامل ہیں جو اسرائیلی فوج اور انٹیلی جنس کے نظام کا حصہ رہے ہیں۔ ان کے مطابق، غزہ میں حملوں کے لیے اہداف طے کرنے میں جدید ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کا استعمال کیا گیا۔ ان گواہوں کا کہنا ہے کہ ان حملوں میں عام شہریوں کی ہلاکتوں کو بھی ایک قابلِ قبول نقصان سمجھا گیا۔ فلم انہی لوگوں کی گواہی کے ذریعے یہ سوال اٹھاتی ہے کہ بے گناہ شہریوں کی جانیں آخر اتنی آسانی سے کیسے ضائع کی جا سکتی ہیں؟

اگر ظلم کے خلاف گواہی دینے والی آوازیں اسی معاشرے کے اندر سے اٹھ سکتی ہیں، تو مظلوم کے اپنے بھائی کب اپنی خاموشی توڑیں گے؟ ایک طرف فلسطینی ماں اپنے بچے کی لاش اٹھا کر دنیا سے انصاف مانگ رہی ہے، دوسری طرف اسی ملک کے بعض لوگ اپنے ہی نظام کے بارے میں سوال اٹھانے اور گواہی دینے کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔

اور ہم؟

ہم غزہ کی خبر دیکھتے ہیں، چند لمحوں کے لیے افسوس کرتے ہیں، سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ شیئر کرتے ہیں، دعا کرتے ہیں، آنکھیں نم ہوتی ہیں—اور پھر زندگی معمول پر آجاتی ہے۔

مگر فلسطین کے لیے زندگی کبھی معمول پر نہیں آئی، وہاں ایک بچہ معمول کی نیند سے محروم ہے، ایک ماں اپنے بچے کا نام ملبے میں تلاش کر رہی ہے، ایک باپ اپنے خاندان کی قبریں گن رہا ہے، اور شاید کسی ملبے کے نیچے آج بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جس کا نام ہماری گنتی میں شامل نہیں ہوا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں NAZA صرف ایک فلم نہیں رہتی، بلکہ ایک سوال بن جاتی ہے۔ ایک ایسا سوال جو ہم سب سے پوچھتا ہے: جب ظلم کے خلاف گواہی دینے والے اپنے ہی گھر سے نکل سکتے ہیں، تو ہم کب اپنی خاموشی توڑیں گے؟

اللہ چاہے تو ظالموں کے درمیان بھی ایسے دل پیدا کر دیتا ہے جو ظلم کے خلاف کھڑے ہوں، سچ بولیں اور اپنے ہی لوگوں کے اعمال پر سوال اٹھائیں۔ شاید یہ بھی اللہ کی ایک نشانی ہے کہ کبھی کبھی حق کی گواہی وہاں سے آتی ہے جہاں سے ہم اس کی توقع نہیں کرتے۔

فلسطین ہمیں صرف اسرائیل سے سوال کرنے کا موقع نہیں دیتا؛ فلسطین ہم سے بھی سوال کرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے

تم نے میرا درد کب محسوس کیا؟ تم نے میری آواز کب سنی؟ تم نے میرے بچوں کے لیے کب کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا؟ اور سب سے بڑھ کر—تم کب تک خاموش رہو گے؟

غزہ کے ملبے میں شاید صرف گھر نہیں دبے ہوئے؛ ہماری انسانیت بھی دفن ہو رہی ہے۔

اور اگر آج ہم نے اس خاموشی کو نہ توڑا تو آنے والی نسلیں ہم سے پوچھیں گی:

جب فلسطین جل رہا تھا، جب ہزاروں معصوم انسان مارے جا رہے تھے، جب بچے اپنے والدین سے اور مائیں اپنے بچوں سے بچھڑ رہی تھیں، جب ظالم کے اپنے گھر سے بھی گواہی آ رہی تھی—تب تم کہاں تھے؟ فلسطین آج ہم سے صرف ہمدردی نہیں مانگ رہا۔ وہ ہماری انسانیت کا امتحان لے رہا ہے۔ محمد اسلم خان یونس دوحہ قطر

aslam.khan282@gmail.com

عصر حاضر کا خطرناک فتنہ فحاشی اور شہوت پرستی

* محمد عادل ارریاوی *

اللہ ربّ العزت کا شکر و احسان ہے کہ جس نے ہمیں دین فطرت پر پیدا فرما کر تمام عالم پر فضیلت اور برتری بخشی ہے۔

ہمارے مذہب اسلام میں بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی بڑی تاکید آئی ہے جب تک یہ کام ہوتا رہے گا امت اصلاح پر رہے گی اس کام کو چھوڑ دینا بگاڑ اور فساد کا باعث بنے گا۔

آج ہر طرح کی برائیوں کا بڑھتا ہوا سیلاب ہے اس دور کو دور جاہلیت کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ کوئی ایسی برائی معاشرہ میں نہیں ہے جو آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے پائی جاتی تھی وہی قتل و غارت گری بے حیائی بے پردگی عریانی فحاشی شراب نوشی کا امنڈ تا ہوا سیلاب ہے۔ آج نہ ماں کی عزت ہے نہ بہن کی نہ بیوی کی پھر سے دور جاہلیت فروغ پا رہا ہے۔ جنسی ضرورت کے لیے شادی کے بجائے جانوروں کی طرح اپنی ہوس مٹانا مردوں کی ذہنیت کو نا جائز پیار و محبت سے معمور کیا جا رہا ہے۔ ایسا ماحول بن چکا ہے کہ ایک مرد و عورت کا شہوت کو کنٹرول کرنا محال ہوتا جارہا ہے حرام تعلقات میں رہنے والی خواتین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اب یہ بڑے شہروں کا معاملہ نہیں رہا چھوٹے موٹے گاؤں میں بھی ایسے واقعات پیش آرہے ہیں روزانہ کتنی عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہو رہی ہے کتنی ہی عورتیں اغوا ہوتی ہیں ہزاروں نا جائز اولا جنم لیتے ہیں نابالغ لڑکیاں زنا سے حاملہ ہو رہی ہیں بغیر نکاح کے ایک مرد اور خاتون جنسی تعلق بنائیں اور کہیں پر بھی رہیں ایسا ماحول بنایا جارہا ہے۔ مغربی تہذیب و ثقافت کو اہمیت دی جارہی ہے۔ قوم کے نوجوانوں کی حالت خراب ہو رہے ہیں۔ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد لغویات اور فضولیات میں وقت گزار رہی ہے۔ نوجوانوں کے ہاتھوں میں قرآن کے بجائے کرکٹ موبائل پبجی اور فری فائر تھما دیا گیا وہ اپنا قیمتی وقت اور قیمتی جوانی لہو ولعب فحاشی اور بے حیائی میں گزار رہے ہیں سگریٹ نوشی شراب نوشی افیم گانجہ چرس گٹکھا ایک فیشن بن گیا ہے۔ زبان پر ماں بہن کے جنسی اعضاء پر مشتمل ہے۔ گالیاں عاشقی کرنا لڑکیوں کو چھیڑنا جنسی زیادتی کرنا موبائل اور لیپ ٹاپ میں فحش اور بے حیائی کے مناظر دیکھ دیکھ کر خواتین زنا بالجبر اور وہ بھی اپنے ہی دوستوں یا رشتہ داروں کی ہوس کا شکار ہو رہے ہیں۔

امتوں کے زوال کا بنیادی سبب اخلاقی بے راہ روی اور جنسی آوارگی ہوتا ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھئے یونانیوں کا زوال رومیوں کا سقوط اور موجودہ تہذیب کا کھوکھلا پن ان سب کے پس پردہ جنسی بے راہ روی کا طوفان بلا خیز کارفرما ہے اہل یونان پر شہوت پرستی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کے یہاں زنا اور فحاشی کو قابل فخر سمجھا جاتا تھا اور وہ قوم لوط کے عمل کی بناء پر قہر الٰہی کا شکار ہو گئے اہل روم کا حال بھی یونانیوں سے کچھ کم نہ تھا جہاں مرد و عورت کی تمیز ہی ختم کر دی گئی اسی طرح ظہور اسلام سے پہلے بھی سماج جنسی بے راہ روی اور بے حیائی کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا اس دور کا عظیم فتنہ عریانیت بے حیائی فحاشی ہے جس نے انسان کو شہوت اور ہوس کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ کچھ خواتین لیبرل اور اوپن مائنڈ کا سہارا لے کر خود کو غیر مردوں کے لیے نمائش کا ذریعہ بن گئی ہیں نکاح کے بغیر آزاد شہوت رانی کو فروغ دیا جارہا ہے یوروپی ممالک میں آزاد شہوت رانی کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں وہاں نہ کوئی بیٹی ہے نہ بہن نہ ماں نہ بیوی لڑکی کو بغیر نکاح کے ساتھ رہنے اور بچہ پیدا کرنے کی تو اجازت ہے اس کو کسی بھی قسم کی سزا کا حقدار نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کے اس عمل کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ نوعمری کے دوران محبت میں گرفتار ہو کر جسمانی تعلق استوار کرنے والی لڑکی کو مانع حمل کی دوائیں مفت دی جاتی ہیں یا پھر ان تعلقات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ان ناجائز بچوں سے نجات کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک رجحان دنیا بھر میں بڑھتا جارہا ہے۔ یوروپی معاشرہ کی طرح دیگر مقامات پر بھی جنسی بے راہ روی اور شہوت پرستی کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ لاکھوں لڑکیاں محبت کے نام پر مردوں کی ہوس کا شکار ہو گئیں۔ ان کی پورن ویڈیو بنائی گئیں۔ بعد میں ان پورن ویڈیو کے ذریعہ بلیک میل کیا گیا۔ بار بار ہوس پوری کی پیسے لیے اور دوستوں کی بھی ہوس پوری کروائی۔ ان حالات کے پیش نظر کتنی ہی لڑکیوں نے خودکشی کی کوشش کی۔ افسوس کے ہر دن ایسے کیس ہونے کے باوجود بھی لڑکیوں کو ہوش نہیں آتا جو مسلسل اپنی عزت نیلام کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

بچے اور بچیاں قرآن و حدیث کی تعلیم چھوڑ کر صرف اسکولوں کالجوں اور کوچنگ سنٹرس کا رخ کر رہے ہیں۔ نوجوان جوڑے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یا کمر اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ وقت گزار کر جوس پی کر ہوٹلوں میں کھانا کھا کر ایک دوسرے کو سب کچھ سونپ دیتے ہیں اور غلط حرکتیں کرتے ہوئے پکڑے جا رہے ہیں۔ بے حیائی کو پرموٹ کیا جا رہا ہے۔

ہم پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ فحاشی اور عریانی کے خلاف نوجوانوں میں شعور پیدا کریں۔ اگر ہم پورے معاشرے کو درست نہیں کر سکتے تو کم از کم ہمیں اپنے بچوں کی نگرانی کرنی ہوگی عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنسی بے راہ روی مرد و زن کی مساوات اور آزادی نسواں کی دین ہے۔

اللہ ربّ العزت ہمیں حیا عفت اور پاکدامنی نصیب فرما ہماری نگاہوں کی حفاظت فرما اور ہمیں ہر قسم کی بے حیائی و فحاشی سے محفوظ فرما آمین یا رب العالمین۔

۱۷/ ستمبر: حیدرآباد۔ کرناٹک کے زخم اور ۱۹۴۸ کا پولیس ایکشن.!!!

شرف الدین سید ۹۳۴۲۵۲۲۳۴۶

تاریخ کے اوراق میں بعض دن جشن کے نہیں، غور و فکر کے لیے ہوتے ہیں۔ ۱۷ ستمبر بھی حیدرآباد دکن کی تاریخ کا ایسا ہی ایک دن ہے۔ برصغیر کی آزادی کی تاریخ صرف ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے شروع ہو کر ختم نہیں ہو جاتی۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت برطانوی ہندوستان کے ساتھ سیکڑوں شاہی ریاستیں بھی موجود تھیں۔ Indian Independence Act 1947 کے تحت ان ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کریں یا اپنی الگ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ حیدرآباد دکن بھی انہی ریاستوں میں سے ایک تھا۔ ریاست حیدرآباد کے حکمران، ساتویں نظام میر عثمان علی خان آصف جاہ مسلمان تھے، جبکہ ریاست کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی۔ اسی طرح جوناگڑھ اور کشمیر (راجہ ہندو اور مسلم رعایا کثیر الآباد) کی صورت حال بھی مختلف نوعیت کی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد ان ریاستوں کا مسئلہ برصغیر کی سیاست کا ایک نہایت پیچیدہ باب بن گیا۔ حیدرآباد نے ہندوستان کے ساتھ فوری الحاق کے بجائے اپنی خود مختار حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ایک Standstill Agreement بھی ہوا، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ موجودہ انتظامی صورت حال کچھ عرصے تک برقرار رہے اور دونوں جانب سے مستقبل کے تعلقات کے بارے میں بات چیت جاری رہے۔ لیکن تقسیم ہند کے ساتھ پورا خطہ پہلے ہی خونریزی، خوف اور بے یقینی کی لپیٹ میں تھا۔ ایسے ماحول میں حیدرآباد کے اندر بھی سیاسی کشمکش شدت اختیار کرتی گئی۔ ایک طرف ہندوستان کے ساتھ الحاق کی حامی تحریک تھی، جسے کانگریس کے مقامی رہنماؤں کی حمایت حاصل تھی، تو دوسری طرف نظام اپنی ریاست کی خود مختاری برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اسی کشیدہ ماحول میں قاسم رضوی کی زیر قیادت رضاکاروں کی سرگرمیاں بھی بڑھیں۔ یہ فیصلہ بعد کے واقعات میں انتہائی متنازع ثابت ہوا۔ سیاسی اختلاف جب طاقت اور تشدد کی زبان اختیار کر لے تو سب سے زیادہ نقصان عام شہریوں ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور پھر ستمبر ۱۹۴۸ آیا۔ ہندوستانی حکومت نے حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی شروع کی جسے سرکاری طور پر Operation Polo کہا گیا۔ یہ کارروائی چند ہی دن جاری رہی اور بالآخر نظام نے ہندوستان سے الحاق قبول کر لیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ کو حیدرآباد کی سابقہ خود مختار حیثیت کا عملی طور پر خاتمہ ہو گیا اور ریاست ہندوستانی یونین کا حصہ بن گئی۔ لیکن تاریخ کا سوال صرف یہ نہیں کہ حیدرآباد ہندوستان میں شامل کیسے ہوا؟ زیادہ اہم سوال یہ بھی ہے کہ

اس عمل کے دوران عام انسانوں کے ساتھ کیا ہوا؟ یہیں سے ۱۷ ستمبر کی تاریخ کا سب سے دردناک باب شروع ہوتا ہے۔ حیدرآباد اور اس کے اطراف میں پولیس ایکشن سے پہلے بھی فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد موجود تھا، لیکن فوجی کارروائی کے بعد مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر تشدد کے الزامات سامنے آئے۔ قتل، لوٹ مار، آتش زنی اور نقل مکانی کے واقعات نے ہزاروں خاندانوں کی زندگی اجاڑ دی۔ ان واقعات کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ خود ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے حالات کی تحقیقات کے لیے سندر لال بھوگنا کی قیادت میں ایک انکوائری کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی سے متعلق روایات اور بعد کی تحقیقات میں متاثرہ علاقوں میں ہونے والے قتل و غارت اور انسانی المیے کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم اس کمیٹی کی رپورٹ کی مکمل دستیابی اور اس کے بعض نتائج پر آج بھی تاریخی بحث جاری ہے۔

نامور مصنف اور مورخ اے جے نورانی نے اپنی تصنیف HYDERABAD DESTRUCTION میں حیدرآباد کے مختلف علاقوں خصوصاً عثمان آباد، لاتھور، ناندیڑ، بیڑ، گلبرگہ اور رائچور میں ہونے والے مبینہ قتل عام کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق پولس ایکشن کے بعد پیش آنے والے واقعات کو صرف فوجی کارروائی یا سیاسی انضمام کے عنوان سے دیکھنا اس دور کے انسانی المیے کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اس پورے دور کو سمجھنے کے لیے صرف ایک کتاب یا ایک مورخ کی رائے پر انحصار کافی نہیں۔ کے ایم منشی کی کتاب THE END OF ERA بھی اس زمانے کے حالات کو سمجھنے کے لیے اہم ماخذ ہے۔ حیدرآباد کا ہندوستانی وفاق میں انضمام محض ایک سادہ سیاسی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے پیچیدہ سیاسی، سماجی اور انسانی عوامل کارفرما تھے۔ حیدرآباد کے ان خونیں دنوں میں بڑی تعداد میں بے گناہ انسان مارے گئے اور ہزاروں خاندان متاثر ہوئے۔

یہاں ایک بنیادی اصول کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی علاقہ میں ایک طبقے کے ہاتھوں دوسرے طبقے پر ظلم ہوا تو اس کی مذمت ضروری ہے۔ لیکن اگر ریاستی طاقت یا کسی مسلح گروہ کے ہاتھوں عام شہریوں کو نشانہ بنایا گیا تو اس کا دفاع کسی سیاسی دلیل سے نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ کو فرقہ وارانہ عینک سے دیکھنے کے بجائے انسانی آنکھ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ حیدرآباد کے ان واقعات کے حوالے سے کئی محققین نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ سرکاری سطح پر ہونے والی تحقیقات کے باوجود اس سانحے کی مکمل تصویر عوام کے سامنے کیوں نہ آسکی؟

بعض رپورٹس اور بعد کی تحقیق میں ہلاکتوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار سے کہیں زیادہ بتائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۸ کا حیدرآباد آج بھی مورخین کے لیے تحقیق کا موضوع ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ تاریخ کے ایسے ابواب اکثر سیاسی ضرورتوں کے مطابق یاد کیے جاتے ہیں۔ کہیں اسے "آزادی" کا دن کہا جاتا ہے، کہیں "انضمام" کا، کہیں "پولیس ایکشن" کا اور کہیں "فتح" کا دن۔ مگر جس گھر میں کسی کا بیٹا مارا گیا ہو، جس خاندان نے اپنا گھر چھوڑا ہو، جس عورت نے اپنے شوہر یا بچے کو کھویا ہو، اس کے لیے یہ دن کسی سیاسی اصطلاح کا نام نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک زخم ہوتا ہے۔

۱۷ استمبر کس کا جشن؟

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ اگر ۱۷ استمبر کو لبریشن ڈے قرار دیا جاتا ہے تو اس کے بعد کے سیاسی اور انتظامی واقعات کو بھی اسی تاریخی تسلسل میں کیوں نہ دیکھا جائے؟ اور اگر ۱۷ استمبر کو یاد کرنا ہے تو کس انداز میں یاد کیا جائے؟

اگر اسے ہندوستانی اتحاد اور ریاستوں کے انضمام کے تناظر میں یاد کیا جائے تو اس تاریخی عمل کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن اسے کسی مخصوص مذہبی طبقے کی شکست یا دوسرے طبقے کی فتح کے طور پر پیش کیا جائے تو یہ تاریخ کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور ان تمام مقتول انسانوں کے ساتھ بھی، جن کا کسی سیاسی فیصلے میں کوئی کردار نہیں تھا۔ حیدرآباد کا انضمام ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا حصہ ہے؛ لیکن حیدرآباد کے عام لوگوں کا خون بھی اسی تاریخ کا حصہ ہے۔

ایک قوم اس وقت بالغ ہوتی ہے جب وہ اپنی تاریخ کے صرف روشن صفحات نہیں پڑھتی بلکہ اپنے تاریک ابواب کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ ہمیں ۱۷ استمبر کو جشن منانے سے پہلے ان قبروں کو بھی یاد کرنا چاہیے، جن پر کسی سیاسی پرچم کا رنگ نہیں تھا۔ حیدرآباد دکن کی تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ سیاسی فتح وقتی ہو سکتی ہے، مگر انسانی المیہ نسلوں تک زندہ رہتا ہے۔ تاریخ کا کام کسی ایک فریق کو ہمیشہ کے لیے مجرم اور دوسرے کو ہمیشہ کے لیے بے گناہ ثابت کرنا نہیں؛ تاریخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ مقتول کی شناخت مذہب سے نہیں، انسان ہونے سے کرے۔ ۱۷ استمبر کو اگر یاد کرنا ہے تو ضرور کریں—مگر جشن سے پہلے ماتم، سیاست سے پہلے انسانیت اور دعوے سے پہلے سچائی کو جگہ دیں۔ کیونکہ خون سے لکھی ہوئی تاریخ کو نعروں سے نہیں، انصاف سے پڑھا جاتا ہے۔

ماضی کی کسی تاریخ کو یادگار بنانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم حال کا سامنا کریں۔ جیسے کلیان کرناٹک کو اب بھی بہتر تعلیم، روزگار، صحت کی دیکھ بھال، صنعتی سرمایہ کاری، آبپاشی، سڑکوں اور بنیادی ڈھانچے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو براہِ راست کسانوں، نوجوانوں اور عام خاندانوں کو متاثر کرتے ہیں۔

یہیں پر نئے وزیر اعلیٰ ڈی کے شیو کمار کی ذمہ داری اہم ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی حکومت انتظامی رفتار کو برقرار رکھ سکے اور اسے خطے کی دیرینہ ضروریات پر مرکوز کر سکے، تو ستمبر کا ایک نیا مطلب اختیار کر سکتا ہے۔ یہ سالانہ موقع صرف تاریخ یاد کرنے کا نہیں بلکہ ترقی کی پیمائش کا بھی بن سکتا ہے۔

اصل امتحان تقریروں، تقریبات یا اعلانات کا نہیں بلکہ نتائج کا ہوگا۔ کلیان کرناٹک نے نسلوں سے اپنے ماضی کا بوجھ اٹھایا ہے۔ اسے اب مزید نسلوں تک درد کا، پسماندگی کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اس لیے شیو کمار کے لیے ستمبر ۱۷ صرف یادگاری تاریخ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ وہ تاریخ ہونی چاہیے جس کے خلاف ان کی حکومت کے کلیان کرناٹک کے تئیں عزم...اور خود ان کی کارکردگی.. کو ناپا جائے۔

غزل

جب بھی گلی تمہاری نظر سے گزر گئی
تصویرِ یار سینے میں پھر سے ابھر گئی

نذرانہ ہم کو جب ملا دھوکا فریب کا
پھر یوں ہوا کے وہ مرے دل سے اتر گئی

جیون کے راستوں سے جو ہمدم بچھڑ گیا
منزل کے ساتھ ساتھ حسیں وہ ڈگر گئی

میں چاہتا تھا چھو لوں گا ماضی کا ہر ورق
خوشبو کی طرح یاد ہوا میں بکھر گئی

چارہ گروں نے مدتوں تشخیص کی عبث
پھر زخم کی جگہ پہ ہماری نظر گئی

جس راستے سے وہ گئی تھی شہر کی طرف
عالم کی یہ نگاہ وہیں پر ٹھہر گئی

آفتاب عالم شاہ نوری
کروشی بلگام کرناٹک
۸۱۰۵۴۹۳۳۴۹

حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ - حیاتِ طیبہ اور کراماتِ عالیہ

اخلاق احمد نظامی
مقام و پوسٹ گلرہا
مہنداول ضلع سنت کبیر نگر

اسلامی تاریخ میں اولیاء اللہ کا وہ مقدس سلسلہ جس نے دلوں کو زندہ کیا، روحوں کو بیدار کیا اور بھٹکے ہوؤں کو اللہ رب العزت سے ملایا، اس میں جو نام سب سے زیادہ روشن سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ محبوب ہے وہ حضرت سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ آپ کو محبوبِ سبحانی، غوثِ اعظم، غوثِ پاک، پیرانِ پیر، دستگیر اور محی الدین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی اولیاء کے تاجدار ہیں اور آپ کی کرامات کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہے۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادتِ باسعادت یکم رمضان المبارک ۴۷۰ ہجری بمطابق ۱۰۷۷ عیسوی کو ایران کے صوبہ جیلان کے قصبہ جیلان میں ہوئی۔ بعض روایات میں ۴۷۱ ہجری بھی مذکور ہے۔

آپ کا نسبِ مبارک والدِ ماجد کی طرف سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ یعنی آپ حسنی حسینی سید ہیں۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام حضرت سید ابو صالح موسیٰ جنگی دوست اور والدہ ماجدہ کا نام سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے۔ آپ کی والدہ بھی وقت کی بڑی ولیہ اور عابدہ زاہدہ خاتون تھیں۔

آپ بچپن ہی سے آثارِ ولایت سے مالا مال تھے۔ فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت آپ اپنی والدہ کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو آپ کی والدہ نے آپ کو علمِ دین حاصل کرنے کے لیے بغداد بھیجا۔ اس وقت بغداد علم و فن کا مرکز تھا۔

راستے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ کا قافلہ جا رہا تھا تو ڈاکوؤں نے قافلے کو لوٹ لیا۔ ایک ڈاکو آپ کے پاس آیا اور پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ آپ نے سچ سچ بتا دیا کہ میرے پاس چالیس دینار ہیں جو میری والدہ نے میری گدڑی میں سی کر دیے ہیں۔ آپ کی سچائی سے متاثر ہو کر ڈاکوؤں کا سردار متاثر ہوا اور اس نے پوچھا کہ تم نے جھوٹ کیوں نہیں بولا؟ آپ نے فرمایا کہ میری ماں نے مجھے سچ بولنے کی نصیحت کی تھی اور میں اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔ یہ سن کر تمام ڈاکو رو پڑے اور انہوں نے توبہ کر لی۔ یہ آپ کی بچپن کی پہلی کرامت اور تبلیغ تھی۔

بغداد میں آپ نے بڑے بڑے محدثین، فقہاء اور علماء سے علم حاصل کیا۔ آپ نے فقہِ حنبلی، حدیث، تفسیر، اصولِ فقہ، علمِ کلام اور تمام مروجہ علوم میں ایسی مہارت حاصل کی کہ بڑے بڑے علماء آپ کے علم کے معترف ہو گئے۔ آپ نے شیخ ابو سعید مخزومی، قاضی ابو سعید مبارک مخزومی اور دیگر اکابر سے فیض حاصل کیا۔

اولیاء اللہ میں مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ قطب، ابدال، اوتاد، غوث۔ غوث کا مقام تمام اولیاء میں سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غوثیتِ کبریٰ کا مقام عطا فرمایا تھا۔ اسی لیے آپ کو غوثِ اعظم کہا جاتا ہے۔ قیامت تک جتنے بھی اولیاء آئیں گے وہ آپ کے زیرِ سایہ ہوں گے۔

خود آپ نے فرمایا: "میرا قدم تمام اولیاء کی گردن پر ہے"۔ جب آپ نے یہ فرمایا تو اس وقت کے تمام اولیاء نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ یہ آپ کی شانِ ولایت کا اعلان تھا۔

آپ سلسلہ قادریہ کے بانی ہیں جو دنیا کا سب سے وسیع سلسلہ ہے۔ آج دنیا کے کونے کونے میں آپ کے مرید اور آپ کے سلسلے سے فیض پانے والے موجود ہیں۔

یاد رہے کہ کرامت حق ہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت آصف بن برخیا کی کرامات کا ذکر ہے۔ کرامت ولی سے ظاہر ہونے والا وہ خارقِ عادت امر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی عزت افزائی کے لیے ظاہر فرماتا ہے۔ غوثِ پاک کی کرامات تو بے شمار ہیں، جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ یہاں چند مشہور کرامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک بار ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے حکم سے اٹھ جا۔ اللہ کے حکم سے وہ لڑکا زندہ ہو گیا۔ اس طرح کی کئی روایات کتب میں مذکور ہیں۔ آپ کی دعا سے مردہ دل بھی زندہ ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ تاجر سمندر میں سفر کر رہے تھے کہ طوفان آ گیا۔ انہوں نے حضرت غوثِ اعظم کو یاد کیا۔ اس وقت آپ بغداد میں وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنا چپل مبارک پانی پر پھینکا اور وہ چپل سمندر میں ان تاجروں کے پاس پہنچ گئی اور طوفان تھم گیا اور کشتی کنارے لگ گئی۔

ایک چور آپ کے گھر میں چوری کی نیت سے آیا۔ جب وہ چوری کر رہا تھا تو آپ کی نظرِ کرم اس پر پڑی۔ آپ کی ایک نظر نے اس چور کی دنیا ہی بدل دی۔ وہ چور اسی وقت تائب ہو گیا اور اللہ کا ایسا ولی بنا کہ وقت کا قطب بن گیا۔

آپ کے پاس جو بھی بیمار آتا، آپ اس کے لیے دعا فرماتے اور اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرما دیتا۔ کئی مادر زاد اندھے آپ کی دعا سے بینا ہوئے۔

ایک بار بغداد میں جنات نے بہت فساد مچا رکھا تھا۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ آپ نے جنات کے سردار کو طلب کیا اور اسے تنبیہ فرمائی۔ آپ کے حکم سے جنات نے بغداد چھوڑ دیا۔ جنات آج بھی آپ سے ڈرتے ہیں اور آپ کا نام سن کر بھاگ جاتے ہیں۔

آپ کے مدرسے میں روزانہ ہزاروں طالب علم اور مہمان کھانا کھاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کھانا کم پڑ گیا لیکن آپ کی برکت سے وہی کھانا سب کے لیے کافی ہو گیا۔ یہ صحابی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح برکتِ طعام کی کرامت تھی۔

آپ کے سامنے جب کوئی آتا تو آپ اس کے دل کا حال بتا دیتے۔ ایک شخص آپ سے ملنے آیا اور اس کے دل میں تکبر تھا کہ میں بڑا عالم ہوں۔ آپ نے اس کے دل کی بات اسے بتا دی اور اس کا تکبر دور کر دیا۔

آپ کی سب سے مشہور کرامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ بارہ سال پہلے میری بیٹی کی بارات دریا میں ڈوب گئی تھی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کے حکم سے وہ پوری بارات دلہا دلہن سمیت زندہ ہو کر باہر نکل آئی۔

آپ کی تعلیمات کا خلاصہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، سنت پر عمل، حرام سے بچنا، لوگوں کی خدمت اور دل کو صاف رکھنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ شریعت میری بنیاد ہے۔ بغیر شریعت کے طریقت کچھ نہیں۔

آپ کی مشہور کتابوں میں غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، اور الفتح الربانی شامل ہیں۔ الفتح الربانی آپ کے وعظوں کا مجموعہ ہے جو دلوں کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ غنیۃ الطالبین فقہ اور تصوف کا عظیم خزانہ ہے۔

آپ ہر روز سینکڑوں لوگوں کو وعظ فرماتے تھے۔ آپ کے وعظ میں یہودی، عیسائی، ڈاکو، بدمعاش سب آتے اور مسلمان ہو کر، توبہ کر کے چلے جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہاتھ پر پانچ لاکھ سے زیادہ لوگوں نے توبہ کی اور ایک لاکھ سے زیادہ یہودی اور عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔

آپ نے ۹۱ سال کی عمر پائی۔ ۱۱ ربیع الثانی ۵۶۱ ہجری بمطابق ۱۱۶۶ عیسوی میں آپ کا وصالِ مبارک ہوا۔ آپ کا مزارِ اقدس بغداد شریف میں ہے جو آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ ہر سال لاکھوں زائرین آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور فیض پاتے ہیں۔ گیارہویں شریف آپ ہی کے نام سے منسوب ہے جو ہر ماہ نہایت عقیدت سے منائی جاتی ہے۔

حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی ہمارے لیے ایک مکمل نمونہ ہے۔ آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ اصل بزرگی اللہ سے ڈرنے میں، سنت پر چلنے میں اور مخلوقِ خدا کی خدمت میں ہے۔ آپ کی کرامات آج بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ جو بھی سچے دل سے "یا غوث المدد" کہتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے وسیلے سے اس کی مدد فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت غوثِ پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کے فیض سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

مذہب اسلام یا مسلمان؟

محمد مسلم کبیر، لاتور

سرکاری فارمز، مردم شُماری میں وضاحت لازمی۔۔

مذہب اور مذہبی شناخت کے درمیان فرق بظاہر معمولی محسوس ہوتا ہے، لیکن جب یہی فرق قانونی، سماجی اور آئینی معاملات میں زیرِ بحث آتا ہے تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ حالیہ دنوں میں ممبئی ہائی کورٹ کے ناگپور بینچ کے ایک فیصلے کے حوالے سے یہ مسئلہ پھر گشت کرنے لگا ہے کہ "مسلمان مذہب ہے یا اسلام مذہب ہے؟" عام گفتگو میں دونوں الفاظ بعض اوقات ایک دوسرے کے مفہوم میں استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن علمی، مذہبی اور قانونی اعتبار سے ان دونوں کے معنی الگ ہیں۔ اور یہ بات آج اس لیے بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ ماہ اکتوبر ۲۰۲۶ سے ملک میں مردم شُماری کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس میں یہ سوال بھی پوچھا جائے گا۔ اس سے قبل ۲۰۱۱ میں ہوئے مردم شُماری میں اس لفظ کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی گئی تھی۔ اور ملک میں عام مسلمانوں میں یہ مسئلہ آج بھی زیرِ بحث ہے۔ حکومت کے کئی سرکاری فارمز اور آنلائن درخواستوں میں مذہب کے متبادل میں کہیں مسلمان تو کہیں اسلام آتا ہے۔ اس سے طلباء اور ضرورت مندوں کو حسب دستاویزات خانہ شُماری میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام مذہب یا دین کا نام ہے اور مسلمان اس دین کو ماننے والے انسان کی شناخت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر کسی سے پوچھا جائے کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو جواب ہو گا اسلام، اور اگر پوچھا جائے کہ آپ کون ہیں یا آپ کی مذہبی شناخت کیا ہے تو جواب ہو گا مسلمان۔ قرآن مجید نے بھی اس فرق کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: ۱۹) یعنی "بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔"

یہاں قرآن نے اسلام کو دین قرار دیا ہے۔ دوسری طرف سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج: ۷۸) یعنی "اسی نے تمہارا نام مسلمان رکھا"۔ گویا قرآن کی زبان میں بھی معاملہ بالکل صاف ہے؛ دین اسلام ہے اور اس دین کے ماننے والے مسلمان ہیں۔

یہ فرق سمجھنے کے لیے ایک سادہ مثال کافی ہے۔ عیسائیت ایک مذہب ہے اور اس کے ماننے والے عیسائی کہلاتے ہیں۔ یہودیت مذہب ہے اور اس کے پیروکار یہودی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام دین ہے اور اس کے پیروکار مسلمان کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اسلام اور مسلمان کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کرنا زبان کے اعتبار سے تو کبھی کبھی قابلِ فہم ہو سکتا ہے، لیکن علمی اور قانونی اعتبار سے یہ درست تعبیر نہیں۔

مسلمان مذہب نہیں، مذہب کی شناخت ہے

مسلمان کسی مذہب کا نام نہیں بلکہ اسلام سے وابستہ شخص کی مذہبی شناخت ہے۔ جس طرح "ہندو" ایک مذہبی پیروکار کے لیے استعمال ہونے والی شناخت ہے اور "ہندومت" مذہبی نظام کا نام ہے، اسی طرح "مسلمان" فرد کی شناخت اور "اسلام" دین کا نام ہے۔

یہاں ایک اور بنیادی بات قابلِ غور ہے۔ مسلمان ہونا ذات نہیں ہے۔ اسلام قبول کرنے والا شخص خواہ عرب ہو، ایرانی ہو، ترک ہو، افریقی ہو، ہندوستانی ہو یا دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو، وہ مسلمان کہلاتا ہے۔

اسلام نے کسی ایک نسل، زبان یا خطے کو مسلمانوں کی شناخت کا لازمی معیار نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں، قوموں، زبانوں اور سماجی طبقات سے تعلق رکھنے والے کروڑوں انسان ایک ہی مذہبی شناخت رکھتے ہیں: مسلمان۔ کسی شخص کا مسلمان ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔ لیکن مسلمان معاشرے میں مختلف نسلی، علاقائی، لسانی اور سماجی برادریاں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں مسلمان اپنی علاقائی یا سماجی برادری کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کی مذہبی شناخت مسلمان ہو سکتی ہے۔ اس لیے: مسلمان ہونا مذہب سے تعلق ظاہر کرتا ہے، جبکہ کسی مخصوص برادری یا سماجی گروہ سے تعلق الگ سوال ہے۔ یہ فرق خاص طور پر اس وقت اہم ہو جاتا ہے جب کسی سرکاری دستاویز، ذات کے سرٹیفکیٹ یا ریزرویشن کے معاملے میں مذہب اور ذات کو ایک دوسرے کا متبادل سمجھ لیا جائے۔

چنانچہ اگر کسی سرکاری یا تاریخی دستاویز میں "مسلمان جولاہا" یا "انصاری مسلمان" لکھا ہوا ہو تو اس کے دو حصے الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ مسلمان مذہبی شناخت ہو سکتی ہے اور جولاہا یا انصاری سماجی یا ذات یا قبیلے کی شناخت۔۔۔۔

@اسلام نے ذات پات کا تصور قبول کیا؟

اسلامی تعلیمات کی سطح پر معاملہ اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ قرآن مجید انسانوں کے درمیان نسلی یا قبائلی تفاخر کو رد کرتے ہوئے فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات: ۱۳) "اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔" یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انسانی گروہ، قبائل اور مختلف سماجی شناختیں اپنی جگہ موجود ہو سکتی ہیں، مگر اللہ کے نزدیک فضیلت کا معیار تقویٰ ہے، پیدائشی گروہی تفاخر نہیں۔

@پھر ذات اور برادری کہاں آتی ہے؟۔

یہ سوال ہندوستانی معاشرے کے تناظر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے درمیان بھی مختلف سماجی اور روایتی برادریاں پائی جاتی ہیں۔ کوئی شخص اپنی علاقائی، خاندانی یا سماجی اور پیشہ ورانہ شناخت کے اعتبار سے کسی برادری سے تعلق رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی مذہبی شناخت مسلمان رہتی ہے۔

یہی نکتہ حالیہ ناگپور بینچ کے ایک مقدمے میں بھی زیرِ غور آیا، جہاں عدالت نے اس امر کو اہم قرار دیا کہ "مسلم" یا "مسلمان" مذہب کی شناخت ہے، اسے بذاتِ خود ذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم اس فیصلے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر مسلمان کسی بھی مخصوص ذات کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ذات کے دعوے کے لیے متعلقہ قانونی معیار، تاریخی دستاویزات اور دیگر شواہد اپنی جگہ ضروری ہیں۔

@اسلام کا پیغام ذات سے بالاتر۔۔۔۔

اسلامی تعلیمات میں انسانی برتری کا معیار ذات، نسل، رنگ یا خاندان نہیں بلکہ تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات: ۱۳) "بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

یہ آیت انسانی معاشرے کی مختلف شناختوں کے وجود سے انکار نہیں کرتی، بلکہ ان شناختوں کو تعارف کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فضیلت کا معیار تقویٰ کو بناتی ہے۔

اسی لیے اسلام نے عرب و عجم، کالے و گورے، مشرق و مغرب اور مختلف قبائل و اقوام کے لوگوں کو ایک ہی ایمانی رشتے میں جوڑا۔

@دین، مذہب اور مسلمان۔۔۔۔۔

ہمارے ہاں ایک اور الجھن لفظ "دین" اور "مذہب" کے حوالے سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ اردو میں مذہب عام طور پر Religion کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ اسلامی اصطلاح میں دین کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع ہے۔ دین میں عقیدہ، عبادت، اخلاق، معاملات، معاشرت اور زندگی گزارنے کے اصول سب شامل ہیں۔ اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے "دین اسلام" ایک زیادہ جامع تعبیر ہے۔ البتہ روزمرہ یا سرکاری زبان میں "مذہب اسلام" کہنا بھی درست اور عام فہم ہے۔ اصل غلطی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں اسلام اور مسلمان کو ایک ہی چیز سمجھ لیا جاتا ہے۔

سرکاری کاغذات میں بھی فرق ضروری۔

یہ فرق صرف مذہبی بحث تک محدود نہیں۔ سرکاری فارم، مردم شماری، تعلیمی ریکارڈ اور قانونی دستاویزات میں بھی اگر سوال ہو: Religion/مذہب؟۔ تو جواب ہو گا: Islam/اسلام۔۔۔ اور اگر سوال کسی شخص کی مذہبی شناخت کے بارے میں ہو تو جواب میں Muslim/مسلمان کہنا درست ہے۔

اسی طرح ذات یا برادری کا سوال الگ ہو گا اور اس کا جواب متعلقہ شخص کی قانونی و سماجی شناخت اور سرکاری ریکارڈ کے مطابق ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ مذہب، ذات، برادری، نسل اور قومیت کو ایک دوسرے کا متبادل سمجھنا درست نہیں۔

@ایک معمولی لفظ، ایک بڑا مفہوم۔۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مذہبی اصطلاحات کو جذبات کے بجائے علم، تحقیق اور درست مفہوم کے ساتھ استعمال کریں۔ "اسلام" کو "مسلمان" اور "مسلمان" کو "اسلام" کہنا بظاہر معمولی لغزش ہے، مگر جب یہی الفاظ عدالت، حکومت، آئین یا کسی سرکاری دستاویز میں استعمال ہوں تو معمولی لغزش بھی بڑے ابہام کا سبب بن سکتی ہے۔

لہٰذا بات بالکل واضح ہے: اسلام دین ہے۔ مسلمان اس دین کا پیروکار ہے۔ مسلمان مذہب کا نام نہیں بلکہ مذہبی شناخت ہے۔ اور کسی مسلمان کی سماجی یا برادری شناخت ایک الگ معاملہ ہے۔

آخر میں یہی کہنا مناسب ہو گا کہ اسلام نے انسان کو ایمان کا رشتہ دیا اور مسلمان اس رشتے کی شناخت ہے۔ الفاظ کے اس فرق کو سمجھنا صرف زبان کی درستگی نہیں بلکہ مذہبی، سماجی اور قانونی شعور کی بھی علامت ہے۔

مولانا عبد الجبار علیمی ثقافی رضوی اشرفی متعدد سلاسل کی خلافت و اجازت سے سرفراز

احمد آباد (پریس ریلیز)
نیپال اردو ٹائمز

دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد کے نائب صدر المدرسین، معروف عالمِ دین و قلم کار حضرت مولانا مفتی عبد الجبار صاحب علیمی ثقافی رضوی اشرفی کو سلسلۂ عالیہ قادریہ، چشتیہ، اشرفیہ کی خلافت و اجازت سے سرفراز کیے جانے پر علمی و روحانی حلقوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کے مختلف علاقوں سے علماء، مشائخ، فضلاء، تلامذہ اور متعلقین نے حضرت مولانا موصوف کو اس عظیم روحانی سعادت پر دلی مبارکباد پیش کی۔

موصولہ اطلاع کے مطابق حضرت مولانا عبد الجبار علیمی ثقافی رضوی اشرفی کو جانشینِ حضور محدث اعظم ہند، سید المفسرین، رئیس المحققین، شیخ الاسلام و المسلمین حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی الجیلانی دامت برکاتہم العالیہ، کچھوچھہ مقدسہ، کے دستِ حق پرست سے سلسلۂ عالیہ قادریہ، چشتیہ، اشرفیہ کی خلافت و اجازت عطا کی گئی۔ یہ نسبت جہاں ایک عظیم علمی و روحانی اعزاز ہے، وہیں طریقت کی امانت، ذمہ داری اور خدمتِ دین کا عہد بھی ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ چند ماہ قبل حضرت مولانا عبد الجبار علیمی صاحب کو شہزادۂ غوثِ اعظم، مریدِ حضور مفتیِ اعظم ہند، حضرت سید تاج الدین نوری صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ، داہود شریف، کی جانب سے بھی سلسلۂ عالیہ قادریہ، برکاتیہ، رضویہ نوریہ کی اجازت و خلافت سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔

اس موقع پر معروف عالمِ دین حضرت مولانا محمد شمیم احمد صاحب نوری مصباحی ناظمِ تعلیمات دارالعلوم انوارِ مصطفیٰ سہلاؤ شریف، باڑمیر (راجستھان)، نے حضرت مولانا عبد الجبار علیمی صاحب کو خصوصی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلسلۂ عالیہ قادریہ، چشتیہ، اشرفیہ کی خلافت و اجازت جیسی عظیم روحانی نعمت اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص اور مشائخِ کرام کی نظرِ عنایت کا مظہر ہے۔

انہوں نے اس نسبت کو باعثِ سعادت و شرف قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ عظیم نسبتیں فقط اعزاز نہیں بلکہ گراں قدر امانت، ذمہ داری اور خدمتِ دین و سلوک کا عہد ہیں۔ انہوں نے حضرت مولانا عبد الجبار علیمی صاحب کے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان مقدس سلاسل کے فیوض و برکات کا امین بنائے، تشنگانِ معرفت کو ان کے ذریعے سیراب فرمائے اور ان کے علم و عمل، اخلاص و للّٰہیت، دعوت و ارشاد اور فیض میں برکت عطا فرمائے۔

حضرت مولانا عبد الجبار علیمی صاحب نے اس روحانی سعادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے مشائخِ کرام کی شفقتوں، دعاؤں اور حسنِ ظن کو اپنے لیے سرمایۂ حیات قرار دیا۔ انہوں نے خلافت کو عظیم امانت اور روحانی ذمہ داری قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ اسے اپنے اسلافِ طریقت کے نقشِ قدم پر چلنے اور خدمتِ دین کے عہد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت شیخ الاسلام مدنی میاں دامت برکاتہم العالیہ کی شفقت و عنایت اور حضرت سید محمد حمزہ میاں اشرفی الجیلانی دامت برکاتہم کی محبت و شفقت کا بھی تذکرہ کیا اور اس سعادت کو اللہ تعالیٰ کے فضلِ محض اور مشائخِ کرام کی نگاہِ کرم کا صدقہ قرار دیتے ہوئے کہا: فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مشائخِ کرام کے فیوض و برکات کو تا قیامت جاری رکھے، ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اخلاص، للّٰہیت، اتباعِ سنت، محبتِ اولیاء اور خدمتِ دین کے ساتھ ان مقدس سلاسل کی امانت کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس روحانی خوشخبری پر متعدد علماء و مشائخ، فضلاء، شاگردوں اور متعلقین نے بھی حضرت مولانا عبد الجبار علیمی ثقافی رضوی اشرفی کو ہدیۂ تبریک پیش کیا اور ان کے لیے اخلاص، استقامت، قبولیت، خدمتِ دین اور فیض و ارشاد میں مزید ترقی کی دعائیں کیں۔

بالخصوص دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد کے جملہ اساتذہ و طلبہ نے حضرت مولانا موصوف کو اس عظیم روحانی سعادت پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا عبد الجبار علیمی صاحب نے تمام علماء، مشائخ، اساتذہ، شاگردوں اور متعلقین کی محبتوں، دعاؤں اور تہنیتی کلمات پر دلی تشکر کا اظہار کیا ہے۔

جن حضرات نے خصوصی طور پر مبارکباد پیش کی، ان میں بالخصوص: حضرت علامہ مولانا کمال احمد علیمی صاحب قبلہ، استاذ و مفتی دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی؛ حضرت مولانا غلام سید علی صاحب قبلہ، استاذ دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، بستی؛ حضرت مفتی اصغر علی اشرفی، شیخ الحدیث دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد؛ ہمدردِ قوم و ملت حاجی منیر الاسلام کلیمی، ناظمِ اعلیٰ دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد؛ حضرت مفتی افتخار احمد مصباحی، صدر المدرسین دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد؛ نمونۂ اسلاف حضرت مفتی مطیع الرحمن نعیمی اشرفی مدنی دارالافتاء احمد آباد؛ حضرت مولانا مفتی سجاد علی مصباحی، صدر المدرسین الجامعۃ الاسماعیلیہ مسولی شریف، یوپی؛ حضرت مولانا اسد اللہ ثقافی صاحب قبلہ، سابق صدر المدرسین جامعہ فیضان اشفاق، ناگور شریف، راجستھان؛ حضرت مولانا فیض احمد مصباحی، شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ، ناگپور، مہاراشٹر؛ حضرت مولانا محمد یونس صاحب قبلہ علیمی، استاذ الجامعۃ الاسماعیلیہ، مسولی شریف، یوپی؛ حضرت مولانا مفتی انیس احمد امجدی، دارالعلوم امجدیہ، ناگپور؛ حضرت علامہ شفیق الرحمن علیمی ثقافی، شیخ الادب دارالعلوم امجدیہ، ناگپور؛ حضرت مولانا مفتی حسنین رضا قادری، صدر المدرسین دارالعلوم حشمت الرضا، بھیونڈی؛ حضرت مولانا مفتی شاہ عالم، استاذ و مفتی دارالعلوم مدینۃ العربیہ، دوست پور، یوپی؛ حضرت مولانا مفتی صادق علی مصباحی، صدر مفتی دارالعلوم فیضان اشرف، باسنی، ناگور، راجستھان؛ حضرت مولانا اظہر الدین علیمی صاحب قبلہ، دارالعلوم فیض اکبری لونی شریف، کچھ، گجرات؛ حضرت مولانا مفتی ریحان رضا امجدی، امجدیہ ناگپور؛ حضرت مولانا حافظ محمد محبوب رضا صاحب قبلہ، یوپی؛ حضرت مولانا شاہد رضا، مہاراشٹر؛ حضرت مولانا شمساد احمد علیمی، بیدولہ، یوپی؛ حضرت مولانا معین الدین، ویراول، گجرات؛ حضرت مولانا غلام احمد، باراں، راجستھان؛ حضرت مولانا محمد فہیم، میوات، راجستھان؛ حضرت حافظ و قاری اعجاز احمد، جامعہ فیضان اشفاق، ناگور، راجستھان؛ حضرت حافظ و قاری صدام حسین، اور دیگر متعدد علماء، فضلاء، تلامذہ و متعلقین شامل ہیں۔

بنگال میں تعلیمی اداروں کا بھگوا کرن!

افتخار احمد قادری

مغربی بنگال میں تعلیمی یکجہتی، قومی وحدت اور حب الوطنی جیسے خوش نما نعروں کی آڑ میں جو تعلیمی منصوبہ بندی سامنے آ رہی ہے اس نے ریاست کے اقلیتی تعلیمی حقوق خصوصاً مسلم تعلیمی اداروں کی خود مختاری اور ان کے تشخص کے حوالے سے نہایت گمبھیر سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ ایک جانب راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سے وابستہ تعلیمی تنظیم ودیا بھارتی کے تعلیمی نیٹ ورک کو وسعت دینے کی تیاری کی جا رہی ہے اور دوسری جانب مدارس کے جداگانہ انتظامی ڈھانچے کو ختم کر کے تمام تعلیمی محکموں کو ایک نظام کے تحت لانے کی بات کی جا رہی ہے۔ بظاہر یہ اقدامات انتظامی یکسانیت اور تعلیمی ہم آہنگی کے عنوان سے پیش کیے جا رہے ہیں لیکن ان کے مضمرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ انتظامی اصلاحات نہیں بلکہ ریاست کے تعلیمی منظر نامے میں ایک مخصوص نظریاتی رجحان کو غالب کرنے کی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ ذرائع کے مطابق ریاست میں ودیا بھارتی سے ملحق کم از کم ایک ہزار نئے اسکول قائم کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے جبکہ اس وقت ریاست میں اس تنظیم کے تقریباً تین سو اسکول موجود ہیں۔ اگر ایک طرف کسی مخصوص نظریاتی تنظیم سے وابستہ تعلیمی اداروں کے دائرہ کار کو غیر معمولی سرعت کے ساتھ وسعت دینے کا منصوبہ بنایا جائے اور دوسری طرف مسلم اقلیت کے صدیوں پرانے تعلیمی اداروں، بالخصوص مدارس کے انتظامی تشخص اور خود مختاری کو محدود کرنے کی تدبیریں کی جائیں تو اس صورت حال کو محض اتفاق قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ تعلیم کسی بھی معاشرے کی فکری تشکیل کا سب سے مؤثر وسیلہ ہوتی ہے اس لیے تعلیمی اداروں کے قیام، نصاب، انتظام اور سرپرستی کے ذریعے نئی نسل کی فکری سمت متعین کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تعلیمی پالیسی میں کسی خاص نظریاتی رنگ کی آمیزش نمایاں ہونے لگے تو اس کے اثرات محض درس گاہوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورے معاشرے کے فکری مزاج کو متاثر کرتے ہیں۔

مغربی بنگال کے مسلم اکثریتی علاقوں، بالخصوص مرشد آباد اور جنوبی ۲۴ پرگنہ کو اس منصوبے میں خصوصی اہمیت دیے جانے کی اطلاعات نے معاملے کی حساسیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مرشد آباد میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت زیادہ ہے اور ایسے علاقے میں اگر نئے تعلیمی اداروں کے قیام کو مبینہ طور پر ملک دشمن سرگرمیوں کے مقابلے حب الوطنی کے فروغ اور قوم پرستی کے استحکام سے جوڑا جائے تو یہ سوال بہر حال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی مخصوص مذہبی آبادی والے علاقے کو پہلے سے ہی شبہ اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے؟ اگر تعلیمی پالیسی کا بنیادی مقصد معیاری تعلیم، سائنسی شعور، اخلاقی تربیت اور شہری ذمہ داریوں کا فروغ ہے تو اس کے لیے کسی مخصوص مذہبی یا لسانی آبادی کو مشتبہ بنا کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ حب الوطنی بلاشبہ ایک مثبت قدر ہے مگر حب الوطنی کو کسی خاص مذہبی شناخت، ثقافتی سانچے یا سیاسی نظریے کے ساتھ مشروط کرنا اس کے مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب، کثیر اللسان اور کثیر الثقافتی ملک میں حب الوطنی کی بنیاد آئین، قانون، مساوات، باہمی احترام اور ملک کی وحدت پر ہونی چاہیے۔ اگر کسی علاقے کے مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ان کے درمیان حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مخصوص نظریاتی تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے تو یہ طرزِ فکر خود اقلیتوں کے شہری کردار پر غیر ضروری سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ مسلمان اس ملک کی تاریخ، تہذیب، آزادی کی جد وجہد اور تعمیرِ وطن میں ایک زندہ اور ناقابلِ انکار حصہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی حب الوطنی کو کسی اضافی سند یا نظریاتی امتحان سے گزارنا نہ انصاف ہے اور نہ ہی تعلیمی حکمت۔ مرشد آباد کا حوالہ اس لیے بھی حساس ہے کہ گزشتہ برس وہاں شدید فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کی صورت حال پیدا ہوئی تھی جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگوں کو نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ ایسے ماحول میں حکومت کی ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ وہ متاثرہ معاشرے میں اعتماد بحال کرے، قانون کی بالادستی یقینی بنائے، تمام طبقات کے تحفظ کا احساس مضبوط کرے اور تعلیمی اداروں کو نفرت کے بجائے مکالمے، رواداری اور باہمی احترام کا مرکز بنائے۔ اگر اسی ماحول میں ایک مخصوص طبقے کی آبادی والے علاقوں کو ملک دشمن سرگرمیوں سے جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ معاشرتی خلیج کو کم کرنے کے بجائے مزید گہرا کر سکتا ہے۔ ہندوستانی آئین اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام چلانے کا حق فراہم کرتا ہے۔ یہ حق محض کسی حکومت کی عطا نہیں بلکہ آئینی ضمانت کا حصہ ہے۔ چنانچہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو مرکزی دھارے میں لانے کے نام پر ان کے بنیادی تشخص، انتظامی اختیار یا مذہبی و ثقافتی خصوصیات کو کمزور کرنا ایک ایسا معاملہ ہے جس پر نہایت محتاط اور آئینی دائرہ کار میں رہ کر غور ہونا چاہیے۔ تعلیمی یکسانیت اگر معیار، شفافیت اور طلبہ کے بہتر مستقبل کے لیے ہو تو اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یکسانیت کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ادارے کی جداگانہ شناخت، تاریخی پس منظر اور آئینی حیثیت کو مٹا دیا جائے۔

شیاما پرساد مکھرجی کے نظریے ایک آئین، ایک نشان، ایک رہنما کا حوالہ دے کر تمام یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے لیے ایک ہی نظام کی ضرورت پر زور دینا بھی اسی بحث کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ سیاسی نظریات اپنی جگہ لیکن ریاستی تعلیمی پالیسی کا بنیادی معیار آئین اور اس کے تحت حاصل حقوق ہونے چاہییں۔ کسی تاریخی سیاسی نعرے یا نظریاتی تصور کو اقلیتی اداروں کی آئینی حیثیت محدود کرنے کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ تعلیمی انتظام میں یکسانیت اور آئینی مساوات دو الگ تصورات ہیں۔ انتظامی نظام کو مؤثر، شفاف اور معیاری بنانا ایک بات ہے، جب کہ مختلف طبقات کو حاصل آئینی حقوق اور ادارہ جاتی خود مختاری کو ختم کرنا دوسری بات۔ ترنمول کانگریس کے سینئر رہنما کنال گھوش کی جانب سے اس حکومتی منصوبے کو اقلیتی اداروں کے خلاف غیر آئینی سازش قرار دیا جانا بھی اسی سیاسی کشمکش کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کا مؤقف ہے کہ اقلیتوں کے جداگانہ تعلیمی ادارے غیر قانونی نہیں بلکہ آئین کے تحت محفوظ حق ہیں اور موجودہ حکومت سیاسی مقاصد کے لیے فرقہ وارانہ تفریق پیدا کر رہی ہے۔ اگرچہ اس معاملے میں سیاسی جماعتوں کے اپنے مفادات اور بیانیے ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی سوال سیاسی جماعتوں سے بالاتر ہو کر آئینی اصولوں کا ہے۔ کسی بھی حکومت کو یہ وضاحت کرنا ہوگی کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے بارے میں اس کی پالیسی کا مقصد واقعی تعلیمی معیار کی بہتری ہے یا ادارہ جاتی خود مختاری کو کمزور کر کے انہیں ایک مخصوص نظریاتی سانچے میں ڈھالنا۔ مدارس کے خلاف بیانیہ بھی اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ماضی میں بائیں بازو کے سابق وزیر اعلیٰ بدھ دیب بھٹاچاریہ کی جانب سے ریاست کے غیر الحاق شدہ مدارس میں مبینہ خفیہ سرگرمیوں کے حوالے سے تشویش ظاہر کی گئی تھی اور بعض مدارس کو ملک دشمن عناصر کی آماجگاہ قرار دینے جیسے الزامات بھی سامنے آئے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مدارس کے بارے میں شبہات کا بیانیہ صرف موجودہ سیاسی ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی کچھ جڑیں سابقہ سیاسی ادوار میں بھی ملتی ہیں۔ تاہم کسی ادارے کے بارے میں عمومی الزام تراشی اور کسی مخصوص ادارے کے خلاف ثبوت کی بنیاد پر قانونی کارروائی میں بنیادی فرق ہے۔ اگر کسی مدرسے میں واقعی غیر قانونی سرگرمی ثابت ہو تو قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے لیکن چند مبینہ واقعات یا الزامات کی بنیاد پر پوری مدرسہ برادری کو مشتبہ بنا دینا نہ قانونی انصاف ہے اور نہ ہی تعلیمی دیانت داری۔ بلاشبہ مدارس ہندوستانی مسلم معاشرے کے تعلیمی اور تہذیبی ڈھانچے کا ایک قدیم حصہ ہیں۔ ان میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں ایسے طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں جن کے لیے یہ ادارے بنیادی تعلیمی سہولت کا ذریعہ ہیں۔ ان اداروں کی اصلاح، معیارِ تعلیم میں بہتری، جدید مضامین کی شمولیت اور انتظامی شفافیت پر گفتگو ضرور ہونی چاہیے مگر اصلاح اور انہدام کے درمیان جو باریک حد ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اصلاح کے نام پر ادارے کی خود مختاری ہی ختم کر دی جائے تو پھر یہ اصلاح نہیں بلکہ ادارہ جاتی مداخلت بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں مدرسہ بورڈز کے بجٹ میں رواں سال مبینہ طور پر چالیس فیصد تک کی کٹوتی کی اطلاعات بھی تشویش پیدا کرتی ہیں۔ ایک طرف مالی وسائل محدود کیے جائیں، دوسری طرف انتظامی انضمام کی منصوبہ بندی ہو اور تیسری طرف ایک مخصوص نظریاتی تعلیمی نیٹ ورک کے لیے بڑے پیمانے پر نئے ادارے قائم کرنے کی تیاری کی جائے تو پالیسی کے مجموعی رخ پر سوال اٹھنا فطری ہے۔ مالی وسائل کسی بھی تعلیمی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ مدارس کو وسائل سے محروم کر کے ان کی کارکردگی متاثر کرنا اور پھر اسی کمزوری کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنا ایک غیر منصفانہ طرزِ عمل ہوگا۔

بنگال میں اگر واقعی تعلیمی اصلاح مطلوب ہے تو اس کا معیار تمام اداروں کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ ودیا بھارتی ہو یا مدرسہ، سرکاری اسکول ہو یا اقلیتی تعلیمی ادارہ، ہر جگہ تعلیمی معیار، اساتذہ کی اہلیت، طلبہ کی سہولت، بنیادی ڈھانچے، امتحانی شفافیت اور قانونی تقاضوں کو یکساں پیمانے پر پرکھا جانا چاہیے۔ کسی ادارے کی نظریاتی وابستگی کو اس کے حق یا مخالفت کا واحد معیار بنا دینا تعلیم کے غیر جانب دار تصور کے منافی ہوگا۔ ریاستی حکومت اگر واقعی تعلیمی ترقی چاہتی ہے تو اسے اپنی تمام توانائیاں معیاری تعلیم، اساتذہ کی تربیت، جدید تعلیمی وسائل اور طلبہ کے بہتر مستقبل پر صرف کرنی چاہییں، نہ کہ تعلیمی اداروں کو سیاسی و نظریاتی کشمکش کا میدان بنانا چاہیے۔ تعلیمی ادارے نسلوں کی فکری تعمیر کرتے ہیں۔ نصاب میں کیا پڑھایا جائے، کس تاریخ کو کس زاویے سے پیش کیا جائے، کن شخصیات کو مثالی قرار دیا جائے اور کس نوعیت کی قومی شناخت تشکیل دی جائے، یہ تمام امور براہِ راست نئی نسل کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے کسی بھی ریاست میں تعلیمی اداروں کا نظریاتی توازن نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر بھگوا کرن کی اصطلاح اس عمل کے لیے استعمال کی جا رہی ہے جس میں تعلیم کے میدان میں ایک مخصوص مذہبی و نظریاتی فکر کا غلبہ بڑھایا جا رہا ہو، تو حکومت کو اس تاثر کا ازالہ محض بیانات سے نہیں بلکہ عملی شفافیت سے کرنا ہوگا۔ مغربی بنگال کا سماجی ڈھانچہ کثیر الجہتی ہے۔ یہاں ہندو، مسلمان اور دیگر برادریاں طویل عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی ہیں۔ ایسی ریاست میں تعلیمی پالیسی کا مقصد معاشرتی فاصلے بڑھانا نہیں بلکہ انہیں کم کرنا ہونا چاہیے۔ اگر مسلم اکثریتی علاقوں میں قائم مدارس اور مسلم تعلیمی اداروں کو مستقل شک کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ان کے مقابلے میں ایک مخصوص نظریاتی ادارہ جاتی نیٹ ورک کو فروغ دیا جائے تو اس سے تعلیمی مساوات کے بجائے معاشرتی بے اعتمادی پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ ریاستی اقتدار کی اصل آزمائش یہی ہے کہ وہ اکثریت اور اقلیت دونوں کے حقوق کو یکساں تحفظ فراہم کرے اور کسی طبقے کو اپنے ہی وطن میں مسلسل صفائی پیش کرنے پر مجبور نہ کرے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مدرسہ اصلاح کے نام پر ہونے والی ہر کارروائی قانون، شفافیت اور آئینی تقاضوں کے مطابق ہو۔ مدارس سے متعلق اگر حکومت کے پاس کوئی قابلِ اعتماد ثبوت، انتظامی خامی یا قانونی خلاف ورزی کا معاملہ ہے تو اسے مخصوص ادارے کے خلاف مخصوص کارروائی کرنی چاہیے۔ اجتماعی الزام، عمومی بدنامی اور ایک پورے تعلیمی طبقے کو مشکوک قرار دینا مسئلے کا حل نہیں۔ اسی طرح اگر حکومت ودیا بھارتی یا کسی دوسری تنظیم کے ہزاروں تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے تو اسے یہ بھی واضح کرنا ہوگا کہ ان اداروں کے نصاب، انتظام اور نظریاتی اثرات کے حوالے سے کون سے غیر جانب دار معیارات نافذ ہوں گے۔ بنگال میں اس وقت اصل ضرورت ایک ایسے تعلیمی نظام کی ہے جو بچوں کو اچھا شہری بنائے، ان میں قانون پسندی، انسانی احترام، سائنسی مزاج، قومی یکجہتی اور معاشرتی ذمہ داری پیدا کرے۔ حب الوطنی کا مطلب کسی ایک طبقے کی ثقافت کو دوسرے پر مسلط کرنا نہیں، بلکہ ملک کے تمام شہریوں کے حقوق کا احترام کرنا ہے۔ قوم پرستی کا مطلب اختلاف رکھنے والے شہری کو مشتبہ سمجھنا نہیں، بلکہ مختلف شناختوں کے باوجود مشترکہ ہندوستانی مستقبل کی تعمیر کرنا ہے۔ اگر تعلیم ان بنیادی اصولوں سے محروم ہو جائے تو اسکول عمارتیں تو رہیں گے، مگر ان میں حقیقی معنوں میں تعلیم کا چراغ مدھم پڑ جائے گا۔ بنگال کے موجودہ تعلیمی منظر نامے میں سب سے زیادہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ حکومت اپنے تمام اقدامات کو آئینی کسوٹی پر پرکھے۔ مدارس کی اصلاح ہو تو شفاف طریقے سے ہو، ان کے مالی معاملات میں بہتری لانی ہو تو مناسب وسائل فراہم کیے جائیں، نصاب بہتر بنانا ہو تو ماہرین تعلیم اور متعلقہ طبقات سے مشاورت کی جائے اور اگر نئے اسکول قائم کرنے ہوں تو ان کا مقصد سیاسی یا مذہبی غلبہ نہیں بلکہ حقیقی تعلیمی ترقی ہو۔ اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کو کمزور کر کے کوئی ریاست مضبوط نہیں ہوتی۔ ریاست اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب اس کے ہر شہری کو یہ یقین ہو کہ اس کے آئینی حقوق محفوظ ہیں۔ بنگال میں تعلیمی اداروں کا بھگوا کرن محض اسکولوں کی تعداد بڑھانے یا انتظامی محکموں کو ایک جگہ جمع کرنے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ریاست کے تعلیمی فلسفے، اقلیتی حقوق اور آئینی مساوات سے متعلق بنیادی سوال ہے۔ اگر تعلیمی یکجہتی کے نام پر اقلیتوں کے جداگانہ اداروں کی شناخت مٹانے کی کوشش کی گئی اور حب الوطنی کے نام پر مخصوص مذہبی و نظریاتی تصور کو نئی نسل کے ذہنوں پر غالب کرنے کی تدبیر اختیار کی گئی تو اس کے نتائج نہایت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کی اصل قوت اس کی یکسانیت میں نہیں بلکہ اس کے تنوع میں مضمر ہے۔ اس لیے بنگال کی تعلیمی پالیسی بھی ایسی ہونی چاہیے جو تنوع کو کمزوری نہیں بلکہ قومی قوت سمجھے، اقلیتوں کے آئینی حقوق کو رکاوٹ نہیں بلکہ جمہوری ضمانت تصور کرے اور تعلیم کو نظریاتی غلبے کا وسیلہ بنانے کے بجائے نسلِ نو کی آزاد، متوازن اور تعمیری فکری تربیت کا ذریعہ بنائے۔

(مضمون نگار معروف صحافی و تجزیہ نگار ہیں)

حوثی کون ہیں، ان کی تحریک کیسے شروع ہوئی؟

طفیل مکسی

صنعاء: یمن میں ایک بار پھر شدید لڑائی اور حوثیوں کی باب المندب کی جانب پیش قدمی کے باعث یہ سوال اہم ہو گیا ہے کہ حوثی دراصل کون ہیں، ان کی تحریک کہاں سے شروع ہوئی اور وہ یمن کی ایک طاقتور سیاسی و عسکری قوت کیسے بن گئے؟

حوثی تحریک، جو باضابطہ طور پر خود کو "انصار اللہ" کہتی ہے، کی جڑیں یمن کے شمالی صوبے صعدہ میں ہیں۔ اس تحریک کا تعلق زیدی شیعہ برادری سے ہے۔ زیدی صدیوں سے شمالی یمن میں آباد ہیں اور ان کا مذہبی مکتب ایران میں غالب اثنا عشری شیعہ مکتب سے مختلف ہے۔

حوثی تحریک کی بنیاد کیسے پڑی؟

حوثی تحریک کے پس منظر میں معروف زیدی عالم بدرالدین الحوثی اور ان کے صاحبزادے حسین بدرالدین الحوثی کا اہم کردار تھا۔ ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کی دہائیوں میں بدرالدین الحوثی یمن میں بڑھتے سلفی اثر و رسوخ کے ناقد بن کر سامنے آئے۔ حوثیوں کا مؤقف تھا کہ سعودی عرب سے آنے والے مذہبی اثرات شمالی یمن کی روایتی زیدی شناخت کو کمزور کر رہے ہیں۔

۱۹۹۰ کی دہائی کے آغاز میں حسین بدرالدین الحوثی نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ وہ اپوزیشن جماعت الحق سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۹۳ میں صعدہ سے یمنی پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے۔ اسی دور میں زیدی مذہبی و ثقافتی شناخت کے احیا کی تحریک مضبوط ہونے لگی، جو آگے چل کر حوثی تحریک کی بنیاد بنی۔

ابتدائی دور میں تحریک کے اہم مطالبات میں سیاسی ناانصافی، بدعنوانی اور شمالی علاقوں کی محرومی کے خلاف آواز اٹھانا شامل تھا، لیکن وقت کے ساتھ یہ تحریک مذہبی و سیاسی دائرے سے نکل کر ایک مسلح قوت میں تبدیل ہو گئی۔

حسین الحوثی کی ہلاکت اور عبدالملک الحوثی کا عروج

۲۰۰۴ میں حسین بدرالدین الحوثی اور اس وقت کے یمنی صدر علی عبداللہ صالح کی حکومت کے درمیان تنازع کھلی مسلح لڑائی میں تبدیل ہو گیا۔ اسی سال یمنی فوج کے ساتھ جھڑپوں میں حسین الحوثی مارے گئے۔

ان کی ہلاکت کے بعد تحریک کا نام انہی سے منسوب ہو کر "حوثی" مشہور ہو گیا اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی عبدالملک الحوثی تحریک کے مرکزی رہنما بن گئے۔ وہ آج بھی انصار اللہ کی قیادت کرتے ہیں۔

صنعاء پر قبضہ کیسے ہوا؟

۲۰۱۱ کی عرب بہار اور علی عبداللہ صالح کی حکومت کے خاتمے کے بعد یمن میں سیاسی عدم استحکام بڑھا اور حوثیوں نے اپنی طاقت اور زیرِ کنٹرول علاقے تیزی سے بڑھائے۔ ستمبر ۲۰۱۴ میں حوثیوں نے دارالحکومت صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے ملک کے دوسرے علاقوں کی جانب پیش قدمی کی۔ صدر عبدربہ منصور ہادی کی حکومت شدید دباؤ میں آ گئی اور بالآخر سعودی عرب منتقل ہو گئی۔

سعودی عرب جنگ میں کیوں اترا؟

مارچ ۲۰۱۵ میں سعودی عرب کی قیادت میں عرب اتحاد نے یمن میں فوجی مداخلت شروع کی۔ سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کا مقصد بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ یمنی حکومت کو بحال کرنا اور حوثیوں کی مزید پیش قدمی روکنا تھا۔

اس کے بعد شروع ہونے والی طویل جنگ نے یمن کو شدید انسانی بحران سے دوچار کر دیا۔ ۲۰۲۲ میں اقوام متحدہ کی ثالثی سے جنگ بندی کے بعد بڑے پیمانے کی لڑائی میں نمایاں کمی آئی، لیکن مستقل سیاسی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

ایران اور حوثیوں کا تعلق

حوثیوں اور ایران کے تعلقات اس تنازع کا سب سے متنازع پہلو ہیں۔ سعودی عرب اور امریکہ طویل عرصے سے ایران پر حوثیوں کو ہتھیار، میزائل اور ڈرون ٹیکنالوجی، تربیت اور دوسری عسکری معاونت فراہم کرنے کا الزام لگاتے آئے ہیں۔ حوثیوں کے حزب اللہ کے ساتھ بھی تعلقات رہے ہیں۔

تاہم حوثی خود کو ایران کا پراکسی قرار دینے کو مسترد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ ایران بھی یہی مؤقف اختیار کرتا ہے۔ حال ہی میں ایرانی وزارت خارجہ کے ترجمان اسماعیل بقائی نے کہا کہ انصار اللہ ایک خود مختار فریق ہے جو اپنے فیصلے خود کرتا ہے اور کسی کے احکامات قبول نہیں کرتا۔

بحیرۂ احمر اور باب المندب کیوں اہم ہو گئے؟

حالیہ برسوں میں حوثیوں نے اپنی میزائل اور ڈرون صلاحیت میں نمایاں اضافہ کیا ہے۔ وہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کو نشانہ بنا چکے ہیں، جبکہ غزہ جنگ کے بعد انہوں نے اسرائیل اور بحیرۂ احمر میں تجارتی جہازوں پر بھی حملے کیے۔ حوثیوں کا کہنا رہا ہے کہ ان کارروائیوں کا مقصد فلسطینیوں کی حمایت کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حوثیوں کی موجودہ پیش قدمی پر عالمی توجہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ باب المندب بحیرۂ احمر کو خلیج عدن اور بحر ہند سے ملاتا ہے اور ایشیا و یورپ کے درمیان تجارت کا انتہائی اہم بحری راستہ ہے۔ اس کے قریب کسی مسلح گروہ کی طاقت میں نمایاں اضافہ عالمی جہاز رانی اور توانائی کی ترسیل پر براہِ راست اثر ڈال سکتا ہے۔

یوں ۱۹۹۰ کی دہائی میں شمالی یمن کی زیدی مذہبی و سیاسی تحریک کے طور پر ابھرنے والا انصار اللہ آج یمن کی سب سے طاقتور مسلح اور سیاسی قوتوں میں شامل ہے — اور اس کی سرگرمیاں اب صرف یمن کی خانہ جنگی تک محدود نہیں رہیں بلکہ سعودی عرب، بحیرۂ احمر اور باب المندب کی سلامتی سے بھی براہِ راست جڑی ہیں۔

نعتِ سرکار ﷺ

ذکرِ احمد نے میرے دل کو اجالا کر دیا
آپ کی نسبت نے عالم میں نرالا کر دیا

نعت آقائے مدینہ جب لبوں پر آ گئی
اشکِ چشمِ تر نے دل کو پھر سے دریا کر دیا

جب تصور میں مدینے کی فضاء آنے لگی
میرے دل نے ہر طرف خوشبو کا چرچا کر دیا

حشر میں جب ہر طرف ہوگی پریشانی بہت
آپ کی آمد نے امت کو کنارہ کر دیا

یا نبی کہہ کر جو نکلا دل سے اک آہِ حزیں
رحمتِ عالم نے اس کو بھی وسیلہ کر دیا

نسبتِ سرکار سے عزت ملی ایسی مجھے
خاک تھا میں آپ نے مجھ کو ستارہ کر دیا

نعت اب سرکار کی لکھتا رہے تو اے حسن
ادنیٰ تھا تو ادنیٰ تھا آقا نے اعلیٰ کر دیا

از قلم: محمد حسن علیمی
لہرولی نول پراسی نیپال

"غزل"

تابش ردولوی
محلہ پورہ بساون
پوسٹ۔ ردولی
ضلع۔ ایودھیا

چمن میں جس طرح پھولوں سے ہر کیاری مہکتی ہے
ہمارے نام سے یوں ہی وفا داری مہکتی ہے

ہمیں نے انقلابِ سبز کی بنیاد رکھی تھی
ہمیں سے امن کی ہر ایک پھلواری مہکتی ہے

ہماری عظمتوں کی آج بھی تاریخ شاہد ہے
لہو میں ڈوب کر اپنی طرحداری مہکتی ہے

حقیقت کو کہاں تک جھوٹ کا جامہ پہناؤ گے
کہیں کاغذ کے پھولوں سے بھی پھلواری مہکتی ہے

کسی کے سامنے ہم سر نگوں ہو جائیں، ناممکن
رگوں میں آج بھی پرکھوں کی خودداری مہکتی ہے

حکومت آج جو اپنی نہیں تو کیا ہوا تابش
کتابوں میں ابھی تک اپنی سرداری مہکتی ہے

(یو۔پی) پن۔ ۲۲۴۱۲۰
موبائل۔ ۹۵۸۰۲۲۸۰۰۳

اسلام میں نشہ آور چیزوں کی حرمت اور اس کی مضر اثرات

نام۔ عبد اللہ عطا کٹیہاری

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کی جسمانی دینی اور معاشرتی فلاح کا ضامن ہے اسلام میں ہر اس چیز سے روکا گیا ہے جو انسان کی عقل کو زائل کرے کردار کو بگاڑ دے اور معاشرہ کو تباہ کر دے۔

پورے حرام چیزوں میں ایک اہم خبیث چیز نشہ ہے آج کے دور میں منشیات اور دیگر نشہ آور اشیانہ صرف فرد کو برباد کرتا ہے بلکہ خاندان اور پورے معاشرہ کو تباہ کر دیتا ہے کہ شراب کی حرمت تحفظ عقل کے لیے ہوئی ہے اور شراب تمباکو دیگر نشہ آور چیزیں نہ صرف نقصان دہ ہے بلکہ انسانی جسمانی کے لیے یہ چیزیں ضرر رساں ہے اس لیے شریعت اسلامیہ نے اس طرح کے ہر عمل کا سنجیدہ نوٹس لیتے ہوئے اسے حرام قرار دیا ہے اور اس کی اس کی تجارت انسانی سماج میں قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔

آیئے اب ہم اپنے موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی تعریف کر دوں۔ شراب اردو لفظ ہے جس کو عربی میں خمر کہتے ہیں خمر کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ممبر رسول پر فرمایا (الخمر ماخامر العقل) اخرجہ مسلم حدیث نمبر ۳۰۳۲۔ شراب وہ ہے جو عقل کو زائل کر دے برباد کر دے عقل کو ڈھانپ لے نشہ کے بارے میں کتاب اللہ میں بہت سی دلائل موجود ہے جن سے نشہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (یا ایھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون) اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ شراب جوا اس طرح کے ہر عمل گندگی ہے تم ان سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ جب اس آیت کریمہ کی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو شراب بہانے کا حکم دیا یہاں تک کہ ایک صحابی کے استفسار پر کچھ یتیم بچوں کا شراب بہانے کا حکم دے دیا اسلام نے پاک چیزوں کو حلال کیا تو اس کے برعکس خبیث چیزوں کو حرام کیا ہے اور شراب میں حرام چیز پائی جاتی ہے۔

سورہ اعراف کی یہ بھی آیت اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے اللہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا (ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث) اللہ تعالیٰ نے طیبات کو حلال کیا ہے اور خبائث کو حرام کیا ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شراب اس کی جڑ ہے اس طرح عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (الخمر فانھا الخبائث) اخرجہ النسائی ۵۶۶۶ شراب تمام خبیث چیزوں کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ نے شراب میں کم فائدہ اور سب سے زیادہ گناہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا (قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما) (البقرہ ۲۱۹) آپ کہہ دے اس میں دنیاوی اعتبار سے کچھ نفع ضرور ہے لیکن دین کے اعتبار سے اس میں بہت بڑا نقصان ہے اور یہ نفع نقصان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس آیت کریمہ کی شان نزول یہ ہے کہ صحابہ کرام کے ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ (افتنا فی الخمر والمیسر مذھبہ للعقل سلبة للمال) اے اللہ کے رسول آپ ہمیں شراب کے بارے میں فتویٰ بتایئے وہ تو عقل کو زائل کر دیتی ہے مال کو برباد کرتی ہے سورہ نساء کی یہ آیت حرام ہونے پر دلالت کرتی ہے شراب اتنی خبیث چیز ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو پی لیتا ہے تو اس کو نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلاۃ وانتم سکرا حتی تعلمون ما تقولون) اے لوگو جب تم نشہ میں مست ہو تو تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم وہ چیزیں جاننے اور سمجھنے لگو جو تم لوگ بول رہے ہو اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف کچھ لوگوں کو کھانے کی دعوت دی تو سب لوگ شراب پی شراب نشہ میں مست ہو گئے اور اذان کا وقت ہو چکا تھا تو سب لوگ نماز پڑھنے لگے تو امام صاحب (قل یا ایھا الکافرون) کی تلاوت کی امام نے اس کو غلط پڑھ دیا لا اعبد ما تعبدون کی جگہ (اعبد ما تعبدون) پڑھا اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور شراب پینے والوں کی تعداد کم ہو گئی۔

احادیث نبویہ میں شراب کی حرمت جگہ جگہ پائی جاتی ہے اور دیگر نشہ آور چیزیں بھی ممنوع پایا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (کل شراب اشکر فھو حرام) صحیح بخاری ۲۲۴ ہر مشروب جو عقل کو ڈھانپ لے وہ حرام ہے چاہے وہ نشے چھوٹے مقدار میں ہو یا بڑی مقدار میں ہو حرام ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے نبی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلایشرب الخمر و من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلایجلس علی مائدہ یشرب علیھا الخمر) اخرجہ طبرانی ۱۱۲۴۲ جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ شراب نہ پیے اور جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ ہرگز اس مائدہ پر نہ بیٹھے جس پر بیٹھ کر شراب پی جا رہی ہو اس طرح شراب کو تمام شر کے جڑ بتاتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (اجتنبوا الخمر فانھا مفتاح کل شر) تم لوگ شراب سے بچو اس لئے کہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے شراب پینے والے پر نبی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (لعن اللہ الخمر وشاربھا وبائعھا ومتبائعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا المحمولة الیہ) سنن ترمذی ۱۲۹۵ شراب پینے والے اور پلانے والے اس کے لے جانے والے اور جن کے لیے لے جایا جائے اس کے بیچنے والے اور خریدنے والے اور اس کے نچوڑنے والے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ایک حدیث میں وارد ہے (من شرب الخمر لم تقبل بہ صلاہ اربعین صباحا یوما) سنن ترمذی ۱۸۶۲ جس نے شراب پی تو اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوگی جو شخص شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کے اندر سے ایمان نکل جاتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لایزنی والزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مومن) (متفق علیہ) زانی جب زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا چور جب چوری کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا شرابی شراب پیتا ہے اس وقت مومن نہیں رہتا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد فرمایا (من زنی او شرب الخمر نزع اللہ منہ الایمان کما یخلع الانسان القمیص من راسہ) (سنن ابن ماجہ ۳۹۳۶) جو زنا کرتا ہے یا شراب پیتا ہے اس سے اللہ اس طرح ایمان کو نکال لیتا ہے جس طرح انسان اپنے سر سے قمیص کو نکالتا ہے آئے ہم نشہ کے مضر اثرات کو جانتے ہیں اس کے سب سے پہلی مضر اثر یہ ہے (۱) عقل کو بند کر دیتی ہے نشہ انسان کو ذائل کرتا ہے مال کو برباد کر دیتا ہے وہ انسان کو اس طرح کر دیتا ہے جیسا کہ ایک جانور ہو یا اس سے بھی بدترین بنا دیتا ہے۔ قرآن میں سورہ اعراف کی یہ آیت بھی قابل غور ہے (لھم قلوب لا یفقھون بھا اولئک کالانعام بل ھم اضل) (آیت نمبر ۱۷۹) ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں وہ چوپایوں کی طرح ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے نشہ انسان کو ایسا حالت پر لے آتا ہے کہ صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا

(۳) خاندانی بربادی: نشہ انسان کو بیوی باپ بیٹے اور بھائی جیسے عظیم رشتوں سے جدا کر دیتا ہے گھر بار وران ہو جاتی ہے حدیث نبوی میں وارد ہے (لا یدخل الجنہ عاق ولا من خمر ولا مکذب بالقدر) (مسند احمد ۱۴۲۰۷) نافرمان اولاد اور شراب کا عادی جنت میں داخل نہیں ہوگا نشہ کرنے والا شخص اکثر اپنے والدین بیوی بچوں کے لیے تکلیف دہ بن جاتا ہے وہ نافرمان ظالم اور غافل بن جاتا ہے

(۴) معاشرتی ذلت: نشہ انسان کی عزت و مقام اور حیثیت چھین لیتا ہے اسے ذلیل و رسوا اور نفرت انگیز کر دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں موجود ہے (انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر) (سورہ مائدہ آیت نمبر ۹۱) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرے نشہ انسان کو اتنا ذلیل کر دیتا ہے کہ خاندان اور محلہ والے اس شخص سے نفرت کرنے لگتے ہیں

(۵) جرائم میں اضافہ: نشہ تمام جرائم کا دروازہ ہے چوری زنا جھوٹ قتل و فساد سب نشے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہے (الخمر ام الخبائث من شربھا وقع علی امہ وخالتہ وعمتہ) (طبرانی) شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے جو اسے پیتا ہے وہ اپنی ماں خالہ اور پھوپھی جیسی عورتوں سے زنا تک جا سکتا ہے جب عقل ختم ہو جائے تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے اور نشہ سب سے پہلے عقل چھینتا ہے

نشہ آخرت کا خسارہ: نشہ جنت سے محرومی کا سبب ہے حدیث نبوی میں وارد ہے (من شرب الخمر فی الدنیا فلم یتب منھا محرما فی الاخرۃ) (صحیح مسلم) جو دنیا میں شراب پیے اور توبہ نہ کرے وہ آخرت میں جنت کی شراب سے محروم کر دیا جائے گا یعنی جو شخص دنیا کی تمام لذتوں میں ڈوبا رہا اللہ تعالیٰ اسے جنت کی پاکیزہ نعمتوں سے محروم کر دے گا..

آخر میں اللہ رب العالمین سے دعا گو ہوں کہ اے بار الہ تو ہمیں نشہ جیسی حرمت چیزوں سے بچا اور مرنے کے بعد جنت میں اونچا مقام عطا فرما۔ آمین

سربراہی سے سرپرستی تک کا سفر

محمد ہاشم القاسمی
(خادم دارالعلوم پاڑا ضلع پرولیا مغربی بنگال) فون ۹۹۳۳۵۹۸۵۲۸

کسی بھی منصب، عہدے یا ادارے کی سربراہی سے بروقت دستبردار ہونا ہمیشہ کمزوری کی علامت نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات یہی دانشمندانہ فیصلہ قیادت کا سب سے بڑا جوہر ثابت ہوتا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ اور منظم ادارے اس بنیادی حقیقت کو بہت پہلے تسلیم کر چکے ہیں کہ کوئی بھی انسان کتنا ہی ذہین، مدبر، تجربہ کار اور مخلص کیوں نہ ہو، وہ زندگی بھر ایک جیسی ذہنی توانائی، فیصلہ کن صلاحیت اور حالات کا ادراک کرنے کی سکت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے دنیا بھر کے کارپوریٹ، سیاسی اور سائنسی اداروں میں عمر، کارکردگی کی مدت اور جانشینی کے اصول طے کیے جاتے ہیں تاکہ تسلسل بھی قائم رہے اور نئے خون کو آگے آنے کا موقع بھی ملے۔

مذہبی و سماجی اداروں کا تضاد

ہمارے مذہبی، سماجی، تعلیمی اور بعض علمی اداروں کا ماحول اس فطری اصول کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے ہاں امام، مفتی، ناظم، صدر، مہتمم یا سربراہ جیسے حساس عہدوں پر بیٹھنے والا شخص منصب کو ایک عارضی ذمہ داری سمجھنے کے بجائے اپنی ذاتی شناخت اور انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ اس کے نزدیک عہدہ چھوڑنا گویا اپنی عزت اور وقار کا جنازہ نکالنے کے مترادف بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ایسا فرد جو کبھی اپنی صلاحیتوں اور خدمات کے بل بوتے پر ادارے کا قیمتی سرمایہ ہوا کرتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود اسی ادارے کی ترقی اور بقا کی راہ میں سب سے بڑی دیوار بن جاتا ہے۔

تجربے کا سرمایے سے رکاوٹ بننے کا سفر

یہ حقیقت کسی فرد واحد کی تحقیر نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک کائناتی اصول ہے۔ عمر کے اضافے کے ساتھ تجربہ تو بڑھتا ہے، مگر ہر آنے والے نئے دور کے تقاضوں اور مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت اسی رفتار سے پروان نہیں چڑھتی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان کا طویل تجربہ حکمت بننے کے بجائے محض ایک بے لچک عادت میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ نئے اور پیچیدہ سوالات کو اپنے پرانے اور فرسودہ جوابات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، دورِ جدید کے تقاضوں کو اپنے ماضی کے پیمانوں پر پرکھتا ہے، اور ہر فکری اختلاف کو اصلاح کے زمرے میں دیکھنے کے بجائے اپنی ذات پر حملہ یا بغاوت سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہیں سے اصل فکری کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

فکری جمود اور نسلوں کا تصادم

جب نظام فرسودہ ہو جائے تو مکالمے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ایک نوجوان نسل کا کوئی فرد جب سوال اٹھاتا ہے کہ "یہ روایتی طریقہ اب کیوں کارآمد نہیں اور نیا راستہ کیوں اپنایا جائے؟" تو بوڑھا اور جمود کا شکار نظام بے نیازی سے جواب دیتا ہے، "ہم تو ہمیشہ سے ایسے ہی کام چلاتے آئے ہیں۔" یہ جملہ کسی گہرے شعوری تجربے کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ فکری بانجھ پن اور جمود کا استعارہ ہوتا ہے۔ تجربہ صرف اس وقت تک قابلِ قدر ہے جب وہ نئی نسل کو منزل کا پتہ دے، لیکن اگر تجربہ نئی نسل کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور نیا راستہ بنانے ہی نہ دے، تو وہ سرمایہ نہیں بلکہ زہر قاتل بن جاتا ہے۔

جانشینی کے بحران اور خوشامدی حصار

ادارے افراد کے لیے نہیں ہوتے، بلکہ افراد اداروں کی آبیاری کے لیے آتے ہیں۔ اصل نقصان یہ نہیں کہ ایک بوڑھا شخص کرسی پر براجمان ہے، بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ اس کی غیر ضروری طویل موجودگی کے باعث اگلی صف کے نوجوانوں کو فیصلہ سازی، قیادت اور تجربہ حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ جب کوئی نوجوان برسوں یہ دیکھتا ہے کہ منصب خالی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا، تو وہ یا تو مایوس ہو کر اس میدان سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو جاتا ہے، یا پھر مجبوری کے تحت اسی فرسودہ اور بیمار نظام کا حصہ بن جاتا ہے جس پر وہ کل تک تنقید کیا کرتا تھا۔ اس طرح قیادت کی صحت مند منتقلی کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ اس پورے زوال کو وہ خوشامدی ٹولہ مزید تقویت دیتا ہے جو ہمیشہ سربراہ کے گرد پروان چڑھتا ہے اور ہر روز کانوں میں یہ رس گھولتا ہے:

"حضرت! آپ جیسا مدبر اس دور میں کوئی نہیں ہے۔"

"آپ کے بعد اس منصب کو سنبھالنے والا کوئی مائی کا لعل پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"آپ ہی اس امت کی آخری اور واحد امید ہیں۔"

بظاہر محبت اور عقیدت پر مبنی یہ جملے دراصل اس قدر خطرناک زہر ہیں کہ مسلسل سماعت کے بعد سربراہ کی خود احتسابی کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ تنقید کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور انسان تعریفوں کے ایک مصنوعی حصار میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔

ریٹائرمنٹ: شکست نہیں، ایک ایثار

عہدے سے سبکدوشی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بزرگ افراد اب کسی مصرف کے نہیں رہے یا معاشرہ ان کی خدمات سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ بزرگ اب انتظامی دباؤ سے نکل کر سرپرست، مشیر، استاد اور فکری مرجع کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ایک دانا بزرگ اپنی زندگی کا آخری حصہ کرسی کا بوجھ اٹھائے بغیر نئی نسل کی تربیت اور فکری رہنمائی میں گزارے، جو کہ زیادہ باوقار، پُرسکون اور مفید طریقہ ہے۔ قیادت کا اصل معیار یہ نہیں کہ کوئی شخص کتنے طویل عرصے تک کرسی پر جمی رہا، بلکہ اس کا حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے کتنے قابل، لائق اور بہترین جانشین تیار کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ اگر کوئی شخص تیس سال تک کسی ادارے کا سربراہ رہے، لیکن اس کے جانے کے بعد ادارہ ایک خوفناک جانشینی کے بحران میں مبتلا ہو جائے، تو یہ اس کی طویل کامیابی نہیں بلکہ اس کے تربیتی نظام کی بدترین ناکامی ہے۔ ***

Photo from Md Hashim Alqasmi

اسلام میں عورت کا مقام

از قلم: عالمہ فاضلہ مقتیہ سائرہ فاطمہ جامعی بنت الحاج جان محمد، جنکپور نیپال

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس نے انسان کے ہر طبقے کے حقوق اور ذمہ داریاں واضح فرمائی ہیں۔ اسلام نے جہاں مرد کو ذمہ داریاں عطا کیں، وہیں عورت کو بھی عزت، احترام، حقوق اور بلند مقام عطا فرمایا۔ اسلام سے پہلے بعض معاشروں میں عورت کو کم تر سمجھا جاتا تھا، اسے وراثت سے محروم رکھا جاتا اور اس کے ساتھ ناانصافی کی جاتی تھی۔

اسلام نے ان تمام ظلم و ناانصافیوں کا خاتمہ کیا اور عورت کو باعزت زندگی گزارنے کا حق عطا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾

ترجمہ: اور عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں۔

(سورۃ البقرۃ:۲۲۸)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق کو تسلیم کیا ہے۔ عورت صرف گھر کی ذمہ داریاں نبھانے والی نہیں بلکہ وہ ایک باعزت انسان ہے، جس کے حقوق کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

عورت بحیثیت بیٹی

اسلام نے بیٹی کو رحمت اور نعمت قرار دیا۔ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ بیٹی کی پیدائش کو باعثِ شرم سمجھتے تھے، مگر اسلام نے اس سوچ کو ختم کیا اور بیٹیوں کی اچھی پرورش کو اجر و ثواب کا ذریعہ قرار دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے بیٹیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی اچھی تربیت کی ترغیب دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی بوجھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے

عورت بحیثیت ماں

اسلام نے ماں کے مقام کو بہت بلند فرمایا۔ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تمہاری ماں"

انہوں نے دوبارہ پوچھا: پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تمہاری ماں"

پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا:

"تمہاری ماں"

پھر پوچھا: پھر کون؟ فرمایا:

"تمہارا باپ"

(صحیح البخاری، صحیح مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کی خدمت، عزت اور حسنِ سلوک کا مقام بہت بلند ہے۔

عورت بحیثیت بیوی

اسلام نے شوہر کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾

ترجمہ: اور عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو۔

(سورۃ النساء:۱۹)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہو۔"

(جامع الترمذی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کے ساتھ محبت، نرمی، عزت اور اچھا اخلاق اختیار کرنا اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔

عورت کے مالی حقوق

اسلام نے عورت کو مہر کا حق دیا اور اسے اس کی ملکیت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً﴾

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دو۔

(سورۃ النساء:۴)

اسی طرح اسلام نے عورت کو وراثت میں بھی حصہ دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ﴾

ترجمہ: مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے۔

(سورۃ النساء:۷)

یہ اسلام کی عظیم تعلیمات میں سے ہے کہ عورت کو اس کا مالی حق دیا جائے اور اس کے مال پر ناحق قبضہ نہ کیا جائے۔

عورت اور عزت وحیا

اسلام نے عورت کی عزت و عفت کی حفاظت کے لیے حیا اور پردے کی تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ مؤمن عورتوں کو اپنی نگاہوں کی حفاظت اور اپنی پاک دامنی کی حفاظت کا حکم فرماتا ہے۔

﴿وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ﴾

ترجمہ: اور مسلمان عورتوں سے فرما دو کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں اور اپنی پاک دامنی کی حفاظت کریں۔

(سورۃ النور:۳۱)

اسلام کا مقصد عورت کو محدود کرنا نہیں بلکہ اس کی عزت، پاکیزگی اور معاشرتی وقار کی حفاظت کرنا ہے۔

عورت اور تقویٰ

اسلام میں کسی انسان کی عزت صرف مرد یا عورت ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

ترجمہ: بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

(سورۃ الحجرات:۱۳)

لہٰذا ایک نیک اور صالح عورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند مقام حاصل کر سکتی ہے۔ وہ اپنے ایمان، عبادت، حیا، اچھے اخلاق اور نیک اعمال کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کر سکتی ہے۔

عورت کا کردار

عورت خاندان کی بنیاد مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک نیک عورت اپنے گھر میں نماز، قرآن، ذکر، حیا، محبت اور اچھے اخلاق کا ماحول قائم کر سکتی ہے۔ ماں اپنی اولاد کی دینی تربیت کر کے آنے والی نسلوں کو سنوار سکتی ہے۔

اسی لیے اسلام نے عورت کو عزت کے ساتھ ذمہ داری بھی عطا فرمائی ہے۔ عورت اگر اپنی ذمہ داریوں کو اخلاص کے ساتھ ادا کرے تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ پورے معاشرے کی اصلاح میں بھی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

اسلام نے عورت کو نہ حقیر سمجھا اور نہ اسے بے سہارا چھوڑا، بلکہ اسے بیٹی کی صورت میں رحمت، ماں کی صورت میں عظیم مقام، بیوی کی صورت میں عزت و محبت اور بہن کی صورت میں شفقت واحترام عطا فرمایا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عورت کے مقام کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھیں۔ عورت کو اس کے جائز حقوق دیں، اس کی عزت کریں، اس کے ساتھ حسنِ سلوک کریں اور اسے دینی تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن و سنت کی تعلیمات کو سمجھنے، عورتوں کے حقوق ادا کرنے اور اپنے گھروں کو ایمان، حیا، محبت اور دین کا گہوارہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

* کتبتہ: مقتیہ سائرہ بنت الحاج جان محمد، جنکپور نیپال *

Weekly The
NEPAL URDU TIMES
Reg.No: 5310 -2082/2083 - www.nepalurdutimes.com

ہفت روزہ
نیپال اردو ٹائمز

سہ لسانی فارمولہ اور اردو زبان: ایک جائزہ

محمد انصار ندوی
چندر سین پور۔ مدھوبنی
رابطہ:-۸۸۷۱۷۴۲۴۴

زبان محض ابلاغِ خیال کا وسیلہ نہیں، بلکہ وہ کسی قوم کے اجتماعی شعور، تہذیبی حافظے، تاریخی ورثے اور فکری تشخص کی امین ہوتی ہے۔ جب کوئی زبان اپنے بولنے والوں کے دلوں میں زندہ رہتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پوری تہذیب، ایک مکمل تمدن اور ایک عظیم فکری روایت بھی زندہ رہتی ہے۔ لیکن جب کسی زبان کو تعلیم، عدالت، انتظامیہ اور معاشرتی زندگی سے آہستہ آہستہ الگ کر دیا جائے تو اس کی کمزوری صرف لسانی مسئلہ نہیں رہتی بلکہ وہ ایک تہذیبی سانحہ بن جاتی ہے۔

ہندوستان اپنی لسانی رنگارنگی کے اعتبار سے دنیا کے منفرد ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں سینکڑوں زبانیں اور ہزاروں بولیاں صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھتی رہی ہیں۔ اس تنوع نے ہندوستانی تہذیب کو وسعت، کشادگی اور ہمہ گیری عطا کی ہے۔ اسی تنوع کے تحفظ کے لیے آزادی کے بعد مختلف تعلیمی پالیسیاں مرتب کی گئیں جن میں سہ لسانی فارمولہ (Three Language Formula) کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔

بادی النظر میں اس فارمولے کا مقصد طلبہ میں لسانی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور مختلف زبانوں سے واقفیت پیدا کرنا تھا، مگر عملی میدان میں اس کی صورت حال نظریاتی مقاصد سے خاصی مختلف رہی۔ بعض زبانوں کو سرکاری سرپرستی اور تعلیمی مواقع حاصل ہوئے، جبکہ بعض زبانیں، خصوصاً اردو، اپنے آئینی حقوق کے باوجود بتدریج تعلیمی نظام کے حاشیے پر پہنچتی گئیں۔

اردو اس ملک کی ان زبانوں میں سے ہے جس نے صدیوں تک ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو اظہار بخشا۔ اس زبان میں مذہب، فلسفہ، تاریخ، شاعری، تنقید، صحافت اور سائنس کے بے شمار علمی ذخائر موجود ہیں۔ یہی زبان آزادی کی تحریک میں بھی عوامی رابطے کا اہم وسیلہ رہی۔ اس کے باوجود جب تعلیمی پالیسیاں عملی شکل اختیار کرتی ہیں تو اردو اکثر ان زبانوں میں شامل دکھائی دیتی ہے جنہیں آئینی تحفظ تو حاصل ہے مگر انتظامی ترجیحات میں مطلوبہ مقام نہیں ملتا۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ کسی بھی تعلیمی پالیسی کی کامیابی کا دارومدار صرف اس کے مقاصد پر نہیں بلکہ اس کے نفاذ پر ہوتا ہے۔ اگر سہ لسانی فارمولہ تمام زبانوں کے ساتھ یکساں انصاف کرتا تو شاید آج اردو کی تدریسی صورت حال اتنی تشویش ناک نہ ہوتی۔ متعدد ریاستوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں کی کمی، اردو اساتذہ کی قلت، نصابی کتابوں کی عدم دستیابی اور انتظامی بے توجہی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ پالیسی اور عمل کے درمیان ایک نمایاں فاصلہ موجود ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے علم وادب کے ہر مسئلے کو تاریخی شعور اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ دیکھا۔ انہی کے اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اس مقالے میں کوشش کی جائے گی کہ جذبات کے بجائے تاریخی حقائق، آئینی دفعات، تعلیمی رپورٹس اور مستند حوالوں کی روشنی میں یہ جائزہ لیا جائے کہ سہ لسانی فارمولہ اردو زبان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوا اور کن پہلوؤں میں اس کے نفاذ نے اردو کے فروغ کو متاثر کیا۔

:-سہ لسانی فارمولے کا تاریخی پس منظر

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ہندوستان کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اتنی متنوع لسانی صورت حال میں تعلیم اور انتظام کی زبانوں کا تعین کس بنیاد پر کیا جائے۔ ایک طرف ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ تھا، دوسری طرف مختلف ریاستیں اپنی علاقائی زبانوں کے تحفظ کی خواہاں تھیں، جبکہ انگریزی اپنی نوآبادیاتی میراث کے باوجود اعلیٰ تعلیم اور انتظامی نظام میں مضبوط حیثیت رکھتی تھی۔

اسی پس منظر میں مختلف تعلیمی کمیشنوں اور کمیٹیوں نے ایک ایسی پالیسی کی ضرورت محسوس کی جو قومی وحدت کو بھی مضبوط کرے اور لسانی تنوع کو بھی محفوظ رکھے۔ چنانچہ کوٹھاری کمیشن (۱۹۶۴–۶۶ء) نے سہ لسانی فارمولے کی سفارش کی، جسے بعد میں قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۶۸ء میں اختیار کیا گیا۔

اس فارمولے کے بنیادی مقاصد یہ تھے:

مادری زبان یا علاقائی زبان میں تعلیم کو فروغ دینا۔

ہندی اور غیر ہندی ریاستوں کے درمیان لسانی ہم آہنگی پیدا کرنا۔

انگریزی کے ذریعے عالمی علوم تک رسائی برقرار رکھنا۔

ہندوستان کی مختلف زبانوں کے احترام اور باہمی رابطے کو فروغ دینا۔

نظری طور پر یہ تصور نہایت متوازن اور جمہوری تھا، مگر عملی نفاذ میں مختلف ریاستوں نے اسے اپنی سیاسی، سماجی اور انتظامی ضروریات کے مطابق نافذ کیا، جس کے نتیجے میں اس کے اثرات یکساں نہ رہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اردو زبان کے حوالے سے متعدد سوالات جنم لیتے ہیں،

:- سہ لسانی فارمولہ: آئینی بنیادیں، ارتقا اور اردو زبان کا قانونی و تعلیمی مقام ہندوستان کا دستور اپنے مزاج کے اعتبار سے وحدت میں کثرت (Unity in Diversity) کا آئینہ دار ہے۔ اس کی روح کسی ایک زبان، ایک تہذیب یا ایک خطۂ ارض تک محدود نہیں، بلکہ اس میں مختلف زبانوں، مذاہب اور ثقافتوں کو یکساں احترام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لیے دستور سازوں نے زبان کے مسئلے کو محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے شہری حقوق، تہذیبی شناخت اور تعلیمی انصاف سے وابستہ قرار دیا۔

زبان کی آزادی دراصل فکر کی آزادی ہے۔ جس قوم کی زبان کمزور ہوتی ہے، اس کی علمی خودمختاری بھی متزلزل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دستورِ ہند نے اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے متعدد دفعات شامل کیں، تاکہ کوئی بھی زبان اکثریت یا اقلیت کی بنیاد پر محرومی کا شکار نہ ہو۔

:-دستورِ ہند میں اردو کا مقام

آئین کی دفعہ ۲۹ ہر شہری کو اپنی زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ کا حق عطا کرتی ہے۔ دفعہ ۱۳۰ قلیتی برادریوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام چلانے کا حق دیتی ہے۔

اسی طرح دفعہ A۳۵۰ ریاستوں کو اس بات کی ہدایت کرتی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں فراہم کرنے کے مناسب انتظامات کیے جائیں، جبکہ دفعہ B۳۵۰ لسانی اقلیتوں کے لیے خصوصی افسر (Special Officer for Linguistic Minorities) کے تقرر کی ضمانت دیتی ہے تاکہ ان حقوق کے نفاذ کی نگرانی کی جا سکے۔

مزید برآں، دستور کی آٹھویں جدول میں اردو کو ان زبانوں میں شامل کیا گیا ہے جنہیں ہندوستان کی تسلیم شدہ زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ یہ محض علامتی اعزاز نہیں بلکہ اس بات کا اظہار ہے کہ اردو ہندوستان کی قومی لسانی وراثت کا اہم حصہ ہے۔

:-سہ لسانی فارمولے کا ارتقا

زبان کے مسئلے پر مختلف ریاستوں میں اختلافات کے پیش نظر ماہرینِ تعلیم نے ایک ایسی پالیسی تجویز کی جس سے قومی یکجہتی خواہش مند طلبہ موجود ہونے کے باوجود اساتذہ دستیاب نہیں، اور کہیں اساتذہ ہیں تو نصابی وسائل ناکافی ہیں۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ پالیسی کے متن سے زیادہ اس کے نفاذ کا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی زبان کا مستقبل صرف آئینی دفعات سے محفوظ نہیں ہوتا؛ اس کے لیے سیاسی عزم، تعلیمی منصوبہ بندی، انتظامی دیانت اور سماجی تعاون بھی ناگزیر ہیں

:-سہ لسانی فارمولہ، اردو اور ہندوستانی ریاستوں کا تقابلی جائزہ

تعلیمی پالیسیاں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتیں جب تک ان کے نفاذ میں دیانت، مساوات اور وسعتِ نظر شامل نہ ہو۔ قانون کا حسن اس کی عبارت میں نہیں بلکہ اس کی عملی تعبیر میں مضمر ہوتا ہے۔ یہی اصول سہ لسانی فارمولے پر بھی صادق آتا ہے۔ اگرچہ اس فارمولے کا مقصد ہندوستان کی تمام زبانوں کو مناسب مقام دینا اور کثیر لسانی معاشرے کو مضبوط کرنا تھا، لیکن مختلف ریاستوں میں اس کے نفاذ کی صورت یکساں نہیں رہی

:-ہندی ریاستوں میں اردو کی صورتِ حال

بہار، اتر پردیش اور بعض دیگر ہندی ریاستوں میں اصولی طور پر اردو کو تیسری زبان کے طور پر اختیار کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ حالیہ سرکاری وضاحت کے مطابق بہار اور اتر پردیش میں تیسری زبان کے طور پر اردو یا سنسکرت کے انتخاب کا انتظام موجود ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف نصاب میں زبان کا نام شامل کر دینا اس کے فروغ کے لیے کافی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ متعدد مقامات پر اردو اساتذہ کی کمی، اسامیوں کی عدم تکمیل، نصابی کتب کی تاخیر اور انتظامی غفلت کے باعث طلبہ اپنی خواہش کے باوجود اردو کا انتخاب نہیں کر پاتے۔ اس طرح آئینی حق اور عملی حقیقت کے درمیان ایک نمایاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

:-بہار میں اردو کی صورتِ حال

بہار اردو کی قدیم علمی و ادبی سرزمین ہے۔ یہاں خانقاہوں، مدارس، مکتبوں، کالجوں اور جامعات نے اردو کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پٹنہ، پھلواری شریف، گیا، دربھنگہ، مدھوبنی، کشن گنج اور دیگر علاقوں نے اردو ادب کو ممتاز اہلِ قلم عطا کیے۔

ریاستی سطح پر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل ہے، مگر اس قانونی حیثیت کے باوجود عملی سطح پر کئی مسائل برقرار ہیں:

اردو اساتذہ کی اسامیوں کا طویل عرصہ تک خالی رہنا۔

اردو میڈیم اسکولوں کی محدود تعداد۔

نصابی وسائل کی کمی۔

دفتری سطح پر اردو کے محدود استعمال کی شکایات۔

یہ صورتِ حال اس امر کی متقاضی ہے کہ محض آئینی اعتراف پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے عملی نفاذ کو بھی یقینی بنایا جائے۔

غیر ہندی ریاستوں کا تجربہ

جن ریاستوں میں علاقائی زبان مضبوط ہے، وہاں سہ لسانی فارمولے کی تعبیر مختلف انداز میں سامنے آئی۔ جنوبی ہند کی بعض ریاستوں نے اپنی لسانی شناخت کو ترجیح دی اور اس فارمولے پر اپنے سماجی و سیاسی حالات کے مطابق عمل کیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں سہ لسانی فارمولہ ایک یکساں نظام کے بجائے مختلف النوع عملی صورتوں میں نافذ ہوا۔

اردو کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ یہ لاکھوں ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، آزادی کی تحریک، تصوف، فلسفہ، تاریخ، صحافت اور جدید ادب کا گراں قدر سرمایہ محفوظ ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے لکھا تھا کہ قوموں کی علمی عظمت ان کی زبانوں کے ذریعے ہی زندہ رہتی ہے۔ اگر زبان کمزور ہو جائے تو اس کے ساتھ علم و ادب کے خزانے بھی رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں۔

اسی حقیقت کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے:

زبانیں قوم کی تہذیب کا آئینہ ہوتی ہیں
زبانیں مر نہیں جاتیں، تو قومیں بھی نہیں مرتیں۔

ایک غیر جانب دار محقق کی حیثیت سے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سہ لسانی فارمولہ بذاتِ خود اردو مخالف نہیں تھا، بلکہ اس کا بنیادی مقصد ہندوستان کی لسانی ہم آہنگی کو فروغ دینا تھا۔ تاہم اس کے نفاذ میں ریاستوں کے درمیان تفاوت، انتظامی کمزوریاں اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم نے اردو سمیت بعض زبانوں کو مطلوبہ فائدہ پہنچنے نہیں دیا۔ اس لیے تنقید کا رخ پالیسی کے بنیادی تصور سے زیادہ اس کے عملی نفاذ کی طرف ہونا چاہیے۔

اردو کا مسئلہ محض ایک زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، آئینی مساوات اور تعلیمی انصاف کا مسئلہ ہے۔ اگر سہ لسانی فارمولے کو اس کی حقیقی روح کے مطابق نافذ کیا جائے، تمام آٹھویں جدول کی زبانوں کے لیے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں، اور مادری زبان میں تعلیم کے آئینی تقاضوں پر عمل ہو، تو اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانیں ترقی کی نئی منازل طے کر سکتی ہیں۔

تعلیم کسی بھی قوم کی فکری تعمیر کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، اور زبان اس تعلیم کی روح ہے۔ جب کوئی تعلیمی پالیسی زبان کے مسئلے سے وابستہ ہو تو اس کے اثرات صرف نصاب تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری تہذیب، ثقافت، قومی یکجہتی اور علمی ترقی پر مرتب ہوتے ہیں۔ اسی تناظر میں سہ لسانی فارمولے کا جائزہ لیا جائے تو اس کے تصور اور اس کے عملی نفاذ کے درمیان واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔

سہ لسانی فارمولے کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ ہندوستان کا ہر طالب علم اپنی مادری یا علاقائی زبان، ایک دوسری ہندوستانی زبان اور انگریزی سے واقف ہو۔ یہ تصور اپنے اندر قومی یکجہتی، ثقافتی احترام اور علمی وسعت کے عناصر رکھتا ہے۔ لیکن کسی بھی پالیسی کی کامیابی اس کے متن سے زیادہ اس کے نفاذ پر منحصر ہوتی ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ آئین نے اسے نظر انداز کیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ آئینی ضمانتوں کو عملی زندگی میں پوری طرح نافذ نہیں کیا گیا۔ جہاں اردو پڑھانے کے لیے اساتذہ نہیں ہوں، وہاں زبان کے انتخاب کا حق محض کاغذی رہ جاتا ہے۔ جہاں نصابی کتابیں وقت پر نہ پہنچیں، وہاں مادری زبان میں تعلیم کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔ اور جہاں انتظامیہ خود زبان کے استعمال میں سنجیدہ نہ ہو، وہاں سرکاری حیثیت بھی عملی فائدہ نہیں پہنچا پاتی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی موجودہ صورتِ حال کا تمام تر ذمہ دار صرف سرکاری نظام نہیں۔ اردو معاشرے کو بھی خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ بہت سے گھرانوں میں اردو بولی تو جاتی ہے مگر بچوں کو اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں سکھایا جاتا۔ بعض والدین معاشی امکانات کے پیشِ نظر انگریزی یا دوسری زبانوں کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ کثیر لسانی تعلیم میں مادری زبان اور دوسری زبانیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ معاون ہو سکتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے ہمیشہ علم کو تعصب سے بلند رکھنے کی تلقین کی۔ اگر انہی کے اندازِ فکر کو معیار بنایا جائے تو سہ لسانی فارمولے پر رائے دیتے وقت بھی اعتدال اور انصاف ضروری ہے۔ نہ ہر ناکامی کا سبب خود فارمولہ ہے، اور نہ تمام کامیابیوں کا سہرا اس کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا تمام ہندوستانی زبانوں کو مساوی مواقع دیے گئے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اصلاح کی ضرورت نفاذ میں ہے، نہ کہ صرف اصول میں۔

عملی تجاویز

دستور ہند کی دفعات ۲۹، ۳۰، A۳۵۰ اور B۳۵۰ پر مؤثر عمل درآمد یقینی بنایا جائے۔

جہاں طلبہ کی مناسب تعداد موجود ہو، وہاں اردو اساتذہ کی فوری تقرری کی جائے۔

اردو کی معیاری نصابی کتابیں جدید اسلوب میں تیار کر کے بروقت فراہم کی جائیں۔

اساتذہ کی تربیت، ڈیجیٹل وسائل اور اردو کی عصری تدریس پر خصوصی توجہ دی جائے۔

سرکاری دفاتر میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کے استعمال کو مؤثر بنایا جائے۔

اردو کو روزگار، تحقیق، ٹیکنالوجی اور جدید علوم سے جوڑنے کے لیے عملی منصوبے تشکیل دیے جائیں۔

والدین اور سماجی ادارے بچوں میں اردو پڑھنے اور لکھنے کا ذوق پیدا کریں، تاکہ زبان صرف گھریلو گفتگو تک محدود نہ رہے۔

اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی ایک درخشاں علامت ہے۔ اس نے صدیوں تک مختلف مذاہب، علاقوں اور ثقافتوں کے درمیان فکری اور تہذیبی پل کا کردار ادا کیا ہے۔ سہ لسانی فارمولہ اگر اپنی حقیقی روح، یعنی لسانی مساوات اور تعلیمی انصاف، کے ساتھ نافذ کیا جائے تو اردو سمیت تمام ہندوستانی زبانیں قومی ترقی میں بھرپور کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان کے مسئلے کو سیاست کے محدود دائرے سے نکال کر علم، تعلیم اور تہذیب کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے۔ جب تک ہر ہندوستانی زبان کو عزت، مساوی مواقع اور عملی تحفظ حاصل نہیں ہوگا، اس وقت تک ہندوستان کی لسانی وحدت بھی ادھوری رہے گی۔

آخر میں علامہ اقبال کا یہ شعر اس پورے مباحثے کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی۔

یہ شعر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ زبانوں کا مستقبل صرف قوانین سے نہیں بنتا؛ اس کے لیے قوموں کا شعور، اہلِ علم کی جدوجہد اور معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری بھی ناگزیر ہے۔

محمد انصار ندوی
چندر سین پور۔ مدھوبنی
رابطہ:-۸۸۷۱۷۴۲۴۴
ای میل

* اقلیتوں کے مشترکہ پلیٹ فارم کی پہل کا ڈاکٹر عمار رضوی نے خیر مقدم کیا *

لکھنؤ (پریس ریلیز)
نیپال اردو ٹائمز

: اتر پردیش کے سابق قائم مقام وزیرِ اعلیٰ اور آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کے قومی صدر ڈاکٹر عمار رضوی نے مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کے رہنماؤں کی جانب سے اقلیتوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کرنے کی پہل کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ فیصلہ ہز ہولینس موسٹ ریورنڈ پیٹر مچاڈو، آرچ بشپ آف بنگلور، کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک اہم ملاقات کے دوران کیا گیا۔

ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ اتر پردیش میں آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کے نام سے ایک فورم ۱۹۸۷ء میں قائم کیا گیا تھا، جو اپنے قیام کے بعد سے ہی ہندوستان کے آئین کے تحت تسلیم شدہ تمام اقلیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے مسلسل مخلصانہ کوششیں کر رہا ہے۔ فورم اقلیتوں کو درپیش مسائل کو ریاستی حکومت کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کے سامنے بھی پیش کرتا ہے اور ان کے جائز مسائل کے حل کے لیے مؤثر کوششیں کرتا ہے۔

انہوں نے ہز ہولینس بشپ پیٹر مچاڈو کی جانب سے اقلیتوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کے لیے کی جانے والی اس قابلِ تحسین پہل کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ اقدام اقلیتوں کے اتحاد، باہمی تعاون اور مشترکہ مسائل کو مؤثر انداز میں متعلقہ حکام تک پہنچانے کی سمت ایک اہم قدم ہے۔

ڈاکٹر رضوی نے اس اہم مشن کے لیے آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کی جانب سے مکمل تعاون کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ فورم ملک کی تمام اقلیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے، ان کے آئینی حقوق کے تحفظ اور ان کے جائز مسائل کو ریاستی و مرکزی حکومتوں تک پہنچانے کے لیے اپنی مخلصانہ کوششیں آئندہ بھی جاری رکھے گا۔ یہ اطلاع آل انڈیا مائنارٹیز فورم فار ڈیموکریسی کے شعبۂ نشر و اشاعت کے سیکریٹری ابو شحمہ انصاری نے فراہم کی۔

Abu Shahma Ansari
Secretary (Publicity & Publication)
All India Minorities Forum for Democracy
Saadatganj, Barabanki (U. P)

لوٹن بازار میں ختمِ قادریہ شریف کی بابرکت محفل کا انعقاد

پریس ریلیز
نیپال اردو ٹائمز

لوٹن بازار، سدھارتھ نگر: ختنۂ مسنونہ کی خوشی کے موقع پر عزیزم محمد حسنین رضا سلمہ القوی، ابنِ حضرت مولانا سمیع اللہ صاحب قبلہ کے لیے ختمِ قادریہ شریف کی ایک بابرکت اور روحانی محفل کا انعقاد ۹ ستمبر ۲۰۲۶ء بروز جمعرات بمقام لوٹن بازار، ضلع سدھارتھ نگر میں نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا گیا۔

محفل میں علاقے کے ممتاز علماء، حفاظ، مشائخ اور معززین سمیت اہلِ خانہ و احباب نے شرکت کی۔ اس موقع پر نانا جان الحاج حضرت مولانا جمال الدین یار علوی صاحب قبلہ خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں مولانا دانش رضا گورکھپوری، مولانا محمد اشفاق صاحب، مولانا ارشد رضا فیضی، مولانا محمد عارف، حافظ شہزاد صاحب، مولانا سیف الزماں اور دیگر علماء و معزز شخصیات نے شرکت کر کے محفل کی رونق بڑھائی۔

محفل کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا، جس کے بعد ختمِ قادریہ شریف اور ذکر و اذکار کا اہتمام کیا گیا۔ علماء کرام نے ختنۂ مسنونہ کی دینی اہمیت اور سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی کے حوالے سے مختصر اور مفید گفتگو فرمائی۔

مقررین نے والدین کو بچوں کی دینی و اخلاقی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دینے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور سنتِ رسول ﷺ کے مطابق سنوارنا والدین کی اہم ذمہ داری ہے۔ اس موقع پر عزیزم محمد حسنین رضا کے لیے صحت و تندرستی، نیک بختی، علم و عمل میں ترقی، دین کی خدمت کی توفیق اور درازیٔ عمر کے لیے خصوصی دعائیں کی گئیں۔ علماء و مشائخ نے اہلِ خانہ کو ختنۂ مسنونہ کی سعادت پر مبارکباد پیش کی اور بچے کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ آخر میں شرکائے محفل کی تواضع کا اہتمام کیا گیا۔ محفل نہایت پُرسکون، روحانی اور خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔ اہلِ خانہ نے تمام علماء، مشائخ، معززین اور احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنی شرکت سے اس بابرکت موقع کو مزید یادگار بنایا۔

از قلم: محمد شفیق علیمی غفرلہ

عینی آپا، قُرّۃ العین حیدر۔ "آگ کا دریا" کی شہرہ آفاق ناول نگار

قُرّۃ العین حیدر،

انجینئر محمود اقبال

(اسٹرکچرل انجینئر و کنسلٹنٹ)
+٦٣٠٩٧٢٧٩٥١٩١

"ماضی ختم نہیں ہوتا، وہ کسی نہ کسی شکل میں حال کے اندر زندہ رہتا ہے"

قُرّۃ العین حیدر، معروف اردو ادیب و افسانہ نگار اور پہلے رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سید سجاد حیدر یلدرم کی ہونہار بیٹی ہیں۔ قرۃ العین، عربی لفظ ہے۔ لفظی معنی ہیں، آنکھوں کی ٹھنڈک یا آنکھوں کا نور۔ "قرّۃ"، عربی میں آنکھوں کی ٹھنڈک کو کہتے ہیں یا دل کا سکون یا محبوب و عزیز شخص۔ العین، مطلب آنکھ۔ قرۃ العین حیدر کو پیار سے "عینی آپا" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ عینی آپا، ٢٠ جنوری، (١٩٢٧)ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا ٨٠ سال کی عمر میں ٢١ اگست، (٢٠٠٧)ء کو نوئیڈا، نئی دہلی میں انتقال ہوا تھا۔ انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ ٢١ اگست ٢٠٢٦ء انکی ١٩ویں برسی ہے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے دور طالب علمی کے زمانہ میں، اس عظیم مصنفّہ کو ہمیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، جب وہ ایک ادبی تقریب کے سلسلہ میں یونیورسٹی تشریف لائی تھیں۔ آپا کی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اردو کی ایک معروف ناول نگار تھیں۔ آپا کی ادبی ماحول میں پرورش ہوئی تھی۔ آپا کو ملا کر وہ کل ٦ بہن بھائی تھے۔ بھائی مصطفی اور آپا ہی بالغ عمر تک پہنچ پائے، بقیہ شومیٔ قسمت سے کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔

قرۃ العین حیدر نے ١٩٥٩ء میں اپنے شہرہ آفاق ناول "آگ کا دریا" کی اشاعت کے بعد اردو ادب کی ایک عظیم المرتبت شخصیت کے طور پر اپنی انفرادیت اور شناخت بنائی تھی۔ صحافت، ادارت اور 'ناولیت' (ہم نے ایک نیا لفظ گھڑا ہے، ٹھیک؟) پر محیط اپنے بھرپور ادبی سفر کے دوران عینی آپا نے ٣٠ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں تقسیمِ ہند کے انسانی المیہ اور اجتماعی یادداشت کو نہایت گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ "آگ کا دریا" کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی و تہذیبی ناول ہے۔ پہلے ہم دریا کو سمجھتے ہیں۔ "دریا" مسلسل بہنے، وقت کے گزرنے اور تہذیب کے تسلسل کی علامت ہے۔ جبکہ "آگ"، تباہی، جنگ، انقلاب، تشدد اور انسانی المیے کی علامت بن سکتی ہے۔ اب ان دونوں الفاظ کو اگر آپ جوڑ کر تصور کریں تو یقیناً، بات آپ کی سمجھ میں آجائیگی۔ "آگ کا دریا" قریب ڈھائی ہزار سالہ بھارتی تاریخ و تہذیب کی کہانی و داستاں ہے۔ اس کا اختتام بیسویں صدی اور تقسیم ہند کے المیہ پر ہوتا ہے۔ اس ناول کی ضخامت مختلف ایڈیشنوں میں قریب ٧٠٠ سے ٨٠٠ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو بجا طور پر "اردو ادب کی ورجینیا وولف" (Virginia Woolf) کہا جاسکتا ہے۔ واضح رہے 'ورجینیا وولف'، بیسویں صدی کی ایک مشہور انگریز ادیبہ تھیں۔ عینی آپا نے اردو نثر میں "شعور کی رو" (Stream of Consciousness) کی "بیانیہ تکنیک" کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شہرہ آفاق تصانیف "آگ کا دریا" اور "آخرِ شب کے ہم سفر" کو اردو ادب کے اہم اور لازوال شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ "آخر شب کے ہم سفر"، ٧٠ کی دہائی میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس ناول میں مصنفہ نے

یہ دکھایا ہے کہ تاریخی واقعات، صرف ملکوں اور حکومتوں کو نہیں بدلتے بلکہ وہ لوگوں کی نجی زندگی، محبت، دوستی اور شناخت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ یہ ایک علامتی کیفیت ہے۔ "شب" محض رات نہیں، بلکہ ایسے تاریخی و تہذیبی دور کی علامت ہے جو اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے، جبکہ "ہم سفر" وہ لوگ ہیں جو بدلتے ہوئے زمانہ کا ایک ساتھ سفر طے کرتے ہیں۔

آئینِ ہند کے ٨ویں شیڈول کے مطابق ٢٢ زبانیں مسلمہ اور سرکاری ہیں، جس میں اردو بھی شامل ہے۔ ناول "آگ کا دریا" کا اب تک ہندوستان کی ١٤ سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بذاتِ خود اپنی ہی ناول کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا، جو "ریور آف فائر" (River of Fire)، کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جسکی وجہ سے انہیں باہر کی دنیا میں بھی پذیرائی ملی۔ مصدقہ اطلاع، کے مطابق قرۃ العین حیدر کو ادب کے نوبل انعام کے لئے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ نوبل انعام کمیٹی نامزدگیوں کو چاہے وہ کسی بھی شعبہ میں ہوں، ٥٠ سال تک خفیہ رکھتی ہے۔ اس بات کا جرمنی میں مقیم منیر الدین احمد صاحب کے ذریعہ پتہ چلا تھا، جنھوں نے پاکستان کے موخر انگریزی روزنامہ "ڈان" (Dawn) میں اپنے ایک مضمون میں انکشاف کیا تھا کہ نوبل انعام کمیٹی نے انہیں اور چند دیگر افراد کو ادب کے نوبل انعام کے لئے، ان کی رائے مانگی تھی، اور انہوں نے اور دیگر نے قرۃ العین حیدر کا نام پیش کیا تھا۔ اس انکشاف پر عینی آپا نے حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ باہر کی دنیا انہیں اور انکے کام کو کیسے جانتی پہچانتی ہے؟ یہاں ایک اور بات بھی واضح ہوتی چلے کہ نوبل انعامات صرف بقید حیات افراد ہی پر نچھاور کئے جاتے ہیں۔ بعد از مرگ پر ابھی تک کوئی پالیسی یا مثال موجود نہیں ہے۔ مگر، ہم اردو اور عینی آپا کے پرستار اور چاہنے والوں کے لئے طمانیت کی بات ہے کہ نوبل انعام آپا کو ملا ہو یا نہ ہو، لیکن فرانس کے ٢٠٠٨ء کے نوبل انعام یافتہ ادیب ژاں ماری گستاو لی کلیزیو (Jean-Marie Gustave Le Clezio) نے اپنی نوبل انعام کی تقریر میں "آگ کا دریا" اور قرۃ العین حیدر کی خوب جم کر تعریف کی تھی اور انکے کام کی پذیرائی کی تھی۔ اس ناول کا مرکزی نکتہ اور سوال ہے کہ "زمانہ بدلتا ہے، سلطنتیں بدلتی ہیں، مذاہب اور سیاسی نظام بدلتے ہیں، لیکن انسان اور اس کی بنیادی خواہشات کس حد تک تبدیل ہوتے ہیں"؟ قرۃ العین حیدر نے یہ احساس دلایا کہ تاریخ صرف بادشاہوں اور جنگوں کا نام نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے مسلسل تجربے کا نام ہے۔ بنیادی طور پر، "آگ کا دریا" ایک فرد کی کہانی سے زیادہ ایک تہذیب کی کہانی ہے۔

کیا آپ نے کبھی عینی آپا کی ناولٹ "چائے کے باغ" پڑھی ہے؟ یہ ناولٹ ملک کے کئی مدارس اور کالجوں کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ پس منظر، اس وقت کا مشرقی پاکستان اور سلہٹ کا علاقہ ہے، جو چائے کے باغات کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ عینی آپا نے سلہٹ میں کچھ دن قیام بھی کیا تھا، جب وہ ایک ڈاکمنٹری سیریز کی فلم بندی کے لئے وہاں پہنچی تھیں۔ طویل "آگ کا دریا" نہ سہی، مختصر ناولٹ "چائے کے باغ" کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کی ادیبہ و مصنفہ تھیں، اور ان کے تخیّل کی اڑان کتنی اونچی تھی۔ "چائے کے باغ" کے ذکر پر کیا آپ کو چائے کی طلب ہورہی ہے؟ تو پھر ایک وقفہ لے لیتے ہیں۔ ایک پیالی چائے کی ہوجائے؟ دم کی نہیں، ایسے ہی جیسے مولانا ابوالکلام آزاد خود اپنے ہاتھوں سے بناکر پیتے تھے۔ اور تو اور "چائے" پر پورا ٣٦١ صفحات کا ایک مضمون بھی لکھا تھا، پتہ نہیں کتنی پیالیاں حلق میں انڈیلنے کے بعد؟ ہم نے دانستہ طور پر آپ کو چائے کی دعوت دی ہے تا کہ آپ تازہ دم ہوجائیں۔ چونکہ آگے چل کر آپ کو، آپا کی ایک حسّاس بات سے واقف کرا سکیں۔ چلئے، اب آگے بڑھتے ہیں اگر آپ چائے کی چسکیاں لے چکے ہوں۔

"آگ کا دریا" ملک کی کئی جامعات کے نصاب میں بھی شامل ہے، چاہے اردو، ہندی یا کوئی اور زبان کا نصاب تعلیم ہو۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں "آگ کا دریا" کا باقاعدہ تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔ اور ایسی ہی کئی دیگر جامعات ہیں، جہاں طلباء کو یہ کتاب نصاب کے طور پڑھنے کو ملتی ہے۔ آپا کی دیگر اہم تصانیف میں، "میرے بھی صنم خانے"، "سفینہ غم دل"، "گردش رنگِ چمن"، "چاندنی بیگم" اور "کارِ جہاں دراز" وغیرہ شامل ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد قرۃ العین حیدر نے اپنے بڑے بھائی مصطفی حیدر کے ساتھ پاکستان ہجرت کی تھی۔ پہلے لاہور میں قیام کیا، اس کے بعد کچھ عرصہ کراچی میں رہیں اور پھر لندن چلی گئیں تھیں۔ قریب دس سال سے زیادہ کا عرصہ باہر گزار کر، وہ ہندوستان دوبارہ مستقل طور واپس لوٹ آئی تھیں۔ (١٩٦٠)ء سے لیکر تقریباً، ٢٠ سال تک وہ ممبئی میں قیام پذیر رہیں۔ عمر کا آخری حصہ نوئیڈا، نئی دہلی میں گذر بسر ہوا۔ لندن میں وہ بی بی سی سے بھی وابستہ تھیں اور پاکستان ہائی کمیشن، لندن میں پریس اتاشی کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ امریکہ کی کئی جامعات، جیسے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، یونیورسٹی آف شکاگو اور یونیورسٹی آف اریزونا وغیرہ میں وہ وزیٹنگ استاد کے طور بھی درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ عینی آپا کو سفر کا بھی بہت شوق تھا۔ انہوں نے ایران، لندن، ترکی، مصر اور امریکہ اور دیگر کئی ممالک کے دورے بھی کئے تھے۔ انسانوں اور تہذیبوں کو قریب سے دیکھا تھا، پرکھا تھا ور اپنی تحریروں میں سینچا اور ڈھالا تھا۔ یقیناً، ان سفری تاثرات نے آپا کے ذہن اور تخیل پر گہرا اثر ڈالا ہوگا؟ اردو ادب کے لئے ان کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں انہیں ہندوستان کے کئی اعلیٰ ترین ادبی اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ کل ملا کر ١٤ سے زیادہ ایوارڈز انہوں نے حاصل کر رکھے ہیں۔ چند نمایاں ایوارڈز میں (١٩٦٧)ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ جو افسانوی مجموعے "پت جھڑ کی آواز" پر تھا۔ (١٩٦٩)ء میں سویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ جو روسی ادب کے اردو تراجم کے لئے تھا۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی ایوارڈ (١٩٨٢)ء، ادبی خدمات کے صلہ میں۔ (١٩٨٩)ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ جو "آخر شب کے مسافر" کے لئے تھا۔ یہ ایک بہت بڑا معتبر ادبی ایوارڈ تصور کیا جاتا ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے پدم شری ایوارڈ (١٩٨٤)، جو بھارت کا تیسرا ابڑا 'پدم' ایوارڈ ہے۔ اور پدم بھوشن (٢٠٠٥)ء جو بھارت کا دوسرا بڑا 'پدم' ایوارڈ ہے۔ اس کے علاوہ عینی آپا کو دیگر خلیجی ممالک سے بھی کئی ایوارڈز ملے ہیں۔

یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ علی گڑھ میں پیدا ہونے کے باوجود، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مین تعلیم حاصل نہ کر سکیں۔ وجہ تھی انکے والد کی ملازمت کے باعث خاندان کو مختلف شہروں میں رہنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ انکی ابتدائی تعلیم دہرادون، لاہور اور لکھنؤ میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان آپا نے دہرادون میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ١٩٤١ء میں لکھنؤ کے معروف و شہرت یافتہ "ازابیلا تھوبرن کالج" (Isabella Thoburn College) سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ١٩٤٥ء میں دہلی کے اندراپرستھ کالج (Indrapastha College) سے انگریزی میں بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی، جو دہلی یونیورسٹی کے تحت آتا ہے۔ ١٩٤٧ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان ہجرت کی تھی۔ ١٩٥٢ء میں آپا نے کیمبرج یونیورسٹی سے جدید انگریزی ادب کا خصوصی کورس کیا۔ انکی تعلیم صرف ادب تک محدود نہیں تھی، انہوں نے گورنمنٹ اسکول آف آرٹ، لکھنؤ سے مصوری کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور یہ سلسلہ مصوری لندن میں بھی جاری رہا۔ انہوں نے لندن کے ریجنٹ اسٹریٹ پالی ٹکنک سے صحافت کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ ان کی شخصیت کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ بہت خوش مزاج، سلیقہ مند، باتونی اور باوقار خاتون تھیں۔ بعض قریبی ذرائع کے مطابق وہ ایک ذہین، خود دار، بے باک، صاف گو اور کبھی کبھار انکی سخت مزاجی بھی دیکھنے میں آتی تھی۔

عینی آپا، زندگی بھر اکیلی اور مجرد رہیں۔ کبھی شادی نہیں کی۔ البتہ، بعض مستند ذرائع سے خبریں بھی ہیں کہ انکی شادی کی بات چیت اردو کے مشہور قلم کار، صحافی، فلم ساز اور ادیب خواجہ احمد عبّاس اور پاکستان کے ایک محقق اور دانشور ابوالخیر کشفی سے ہوئی تھی، لیکن بوجوہ، دونوں بار بات آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ ایک دلچسپ لیکن حیران کن واقعہ یہ بھی ہے کہ عینی آپا اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر کی ملاقات ممبئی میں ہوئی تھی، جب وہ (١٩٧٨)ء کے آخر میں ہندوستان کے دورہ پر تھیں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد پروین نے ایک نظم "قرّۃ العین" لکھی، جو (١٩٧٨)ء میں پاکستانی رسالہ "سیپ" میں شائع بھی ہوگئی۔ نظم کے آغاز میں، پروین نے آپا کو "موہنی" سے تشبیہ دی تھی۔ موہنی سے مطلب، ایسی شخصیت جو زندگی کے زہر سے بھی امرت کشید کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن، اس کے ہاتھ میں امرت کا پیالہ ہونے کے باوجود وہ خود پیاسی ہے۔ نظم کے آخر میں پروین ایک اور تضاد کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سورج، دوسروں کو روشنی دیتا ہے، لیکن اپنے ہی برج کی تاریکی دور نہیں کر پاتا۔ جب آپا کو نہ چلا تو انہوں نے ٣ جنوری، (١٩٧٩)ء کو پروین کو خط لکھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ وہ اس نظم کو اپنی نجی زندگی میں بیجا مداخلت سمجھتی ہیں۔

پروین نے اس خط کا جواب ٨ فبروری، (١٩٧٩)ء کو دیا تھا۔ پروین نے جواب میں صفائی پیش کی تھی اور معافی چاہی تھی کہ اس کا مقصد ان کا دل دکھانا نہیں تھا اور جواب دیا تھا کہ وہ صرف ایک "تاثراتی" نظم تھی۔ اردو ادب کی دو نامور، ادیبہ اور شاعرہ کی نوک جھونک، باہمی احترام کی ایک نادر مثال بھی ہے۔ فلمی ڈائیلاگ کی طرح "شادی کا لڈو کھاکے بھی پچھتاؤ، نہ کھاکے بھی پچھتاؤ"۔ پروین نے کھا کر پچھتایا، اور طلاق ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے برعکس، آپا نے کبھی اس حساس مسئلہ پر کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ نجی زندگی، نجی ہی رہنے کو وہ ترجیح دیتی تھیں۔ وہ پچھتائی نہیں تھیں، کہتی تھیں کہ بچپن میں، میں نے اپنی گڑیا کی بھی شادی کسی گڈے سے نہیں کرائی تھی۔ عینی آپا کے بارے میں اتنا کچھ پڑھنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ وہ کافی خود دار، حسّاس طبیعت کی مالک اور ایک پر وقار خاتون تھیں۔ لوگ زندگی میں سمجھوتہ کرلیتے ہیں، زندگی میں آگے بڑھتے ہیں، گاہے بگاہے اپنے آنگنوں میں گل کھلاتے رہتے ہیں۔ یہی آگ ہے، یہی دریا ہے اور یہی ادوار بھی ہیں، یہی زندگی ہے، یہی تہذیب بھی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ داستاں گو کی ذاتی داستان ادھوری ہی رہ گئی، ایسے ہی جیسے مشہور پاکستانی ڈرامہ "ان کہی" کی طرح، عینی آپا کے "دل کی بات" بھی 'ان کہی' اور ادھوری رہ گئی ہو؟ بقول ثاقب لکھنوی!

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

ہم بھی ان کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے بات یہیں ختم کرتے ہیں۔ اردو ادب کی یہ دونوں عظیم خواتین آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن اردو ادب کی خدمات کے لئے انہیں سلام اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ پروین شاکر ہی کی زبان میں!

کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کے در کبھی دربدر
غمِ عاشقی ترا شکریہ میں کہاں کہاں سے گزر گیا

Engineer Mahmood Iqbal
Mobile: 6309727951
Jaweed Villa-Ground Floor

حضرت مولانا مجیب بستوی صاحب، سمریاواں کی مٹی کا روشن چراغ

از قلم-اخلاق احمد نظامی
مقام و پوسٹ گلرہا مہنداول ضلع سنت کبیر

تپہ اجیار کا نام آتے ہی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ جاتا ہے جہاں کھیتوں میں سرسوں کے پھول، دھان گیہوں و مٹر وغیرہ کے فصل لہراتے ہیں، دور تک پھیلی ہوئی ہریالی میں کچے راستے بل کھاتے ہیں، اور اسی تپہ کے بیچوں بیچ مسلم اکثریتی بازار سمریاواں اپنی تہذیبی آب و تاب کے ساتھ آباد ہے۔ یہ صرف بازار نہیں، یہ دلوں کا سنگم ہے، یہ تہذیب کا مرکز ہے، یہ محبتوں کا مسکن ہے۔ اسی بازار کی ایک سادہ سی گلی میں ایک ایسی ہستی رہائش پذیر ہے جس کی عمر ستر برس سے تجاوز کرچکی ہے، مگر ہمت آج بھی جوان ہے، قلم آج بھی رواں ہے، اور دل آج بھی آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مراد ہیں انجمن افکارِ ادب ضلع سنت کبیر نگر کے صدر اور انجمن تعلیماتِ دین بستی کے منتظم و آرگنائزر، حضرت مولانا مجیب بستوی صاحب دامت برکاتہم۔

آپ ایک بہترین قلمکار، ایک حساس شاعر، ایک نکتہ شناس ادیب، علم و ادب، تقویٰ اور پرہیز گاری کی روشن مثال ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلکی اعتبار سے کسی سے بھید بھاؤ نہیں کرتے۔

آج ہم آپ کی شخصیت کے انہی پہلوؤں کو ادبی پیرائے میں دیکھنے کی کوشش کریں گے، سلام میں پہل اور عاجزی سے ان کا قریبی ناطہ ہے کہتے ہیں کہ انسان کی پہچان اس کے سلام سے ہوتی ہے۔

سمریاواں بازار کی شام ہے۔ ایک سفید ریش بزرگ، جس کا جسم عمر کے بوجھ سے کمزور ہو چکا ہے، بازار سے گزر رہا ہے۔ سامنے سے دو بچے آ رہے ہیں۔ لوگوں نے سوچا کہ بچے بزرگ کو سلام کریں گے۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔ بزرگ نے دور سے ہی مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور کہا "السلام علیکم بچو"۔ یہی وصف ان کی شان کو دوبالا کرتی ہے

سنت کبیر نگر اور بستی کے لوگ گواہ ہیں کہ مولانا مجیب بستوی صاحب نے کبھی کسی کو چھوٹا نہیں سمجھا۔ آپ کے نزدیک ہر انسان قابلِ احترام ہے۔ چاہے وہ مدرسے کا طالب علم ہو یا بازار کا مزدور، چاہے وہ بڑا تاجر ہو یا چھوٹا دکاندار، چاہے وہ اسکول کا بچہ ہو یا مسجد کا بوڑھا۔ آپ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی یہی عادت آپ کو بڑا بناتی ہے۔

آج کے اس متکبرانہ دور میں جہاں ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سلام کیا جائے، ستر سال سے زائد عمر کا یہ ضعیف شخص خود سلام میں پہل کرتا ہے۔ یہ سنتِ نبوی ﷺ کی زندہ تصویر ہے۔ یہ تکبر کے اس دور میں عاجزی کی سب سے بڑی مثال ہے مولانا مجیب بستوی صاحب کی شخصیت میں قدرت نے عجیب توازن رکھا ہے۔ آپ خوش مزاج اتنے کہ آپ کی مجلس میں بیٹھنے والا کبھی بور نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس سچی کہانیوں کا خزانہ ہے، اشعار کا ذخیرہ ہے، اور بزرگوں کے واقعات کا انبار ہے۔ آپ جب بولتے ہیں تو ماحول میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ آپ کی باتوں میں لطافت ہے، چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ ہے۔ اور سنجیدہ و باوقار اتنے کہ جب کوئی علمی یا ادبی مسئلہ آ جائے تو آپ ایک ایک لفظ تول کر بولتے ہیں۔ آپ کی نرم طبیعت کا عالم یہ ہے کہ سخت سے سخت بات کو بھی آپ نرمی سے سن لیتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی کی بات کا جواب سختی سے نہیں دیا۔ آپ کا باوقار انداز ایسا ہے کہ بڑے بڑے خطیب اور شاعر آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر دیتے ہیں۔ یہ وقار عہدے کا نہیں، عمر اور کردار کا وقار ہے۔ یہ ستر سال کی عبادت، ریاضت اور مطالعے سے پیدا ہونے والا وقار ہے۔ رات کا سناٹا ہے۔ سمریاواں بازار بند ہو چکا ہے۔ صرف ایک کمرے میں روشنی جل رہی ہے۔ وہاں ایک ستر سالہ شخص عینک لگائے، جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ کبھی وہ شعر لکھتا ہے تو کبھی مضمون، کبھی کسی ادبی اجلاس کی صدارتی تقریر لکھتا ہے تو کبھی کسی طالب علم کی اصلاح کرتا ہے۔ اللہ نے آپ کو قلم کی بڑی دولت سے نوازا ہے۔ آپ ایک بہترین قلمکار ہیں۔ آپ کی تحریر میں سلاست ہے، روانی ہے، اور تہذیب ہے۔ آپ جو لکھتے ہیں وہ دل سے نکلتا ہے۔ آپ ایک بہترین شاعر ہیں۔ آپ کا شعر دل سے نکلتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ آپ ایک نکتہ شناس ادیب ہیں۔ آپ کو اردو زبان سے عشق ہے۔ آپ کے جملوں میں چاشنی ہے اور آپ کے مضامین میں تہذیب کی خوشبو ہے۔

انجمن افکارِ ادب سنت کبیر نگر کے صدر کی حیثیت سے آپ نے اس پورے خطے میں ادب کا دیا روشن کر رکھا ہے۔ آپ کی قیادت میں کئی مشاعرے، ادبی نشستیں اور محافل منعقد ہوئیں۔ آپ نے ہمیشہ نوجوانوں کو آگے بڑھایا، ان کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ کہتے ہیں کہ ادب نفرت کے لیے نہیں، محبت کے لیے ہے۔

اور انجمن تعلیماتِ دین بستی کے آرگنائزر کے طور پر آپ نے دین کی شمع کو روشن رکھنے کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ نے گاؤں گاؤں جا کر تعلیمِ دین کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ آپ کا مقصد صرف تقریر کرنا نہیں، بلکہ لوگوں کے دلوں میں دین کی محبت پیدا کرنا ہے۔

آپ کی زندگی تقویٰ اور پرہیز گاری کی روشن مثال ہے۔ آپ کی زندگی میں تقویٰ نمود و نمائش کا نام نہیں، بلکہ خاموش عمل کا نام ہے۔ آپ راتوں کو عبادت کرنے والے، دن کو مخلوق کی خدمت کرنے والے انسان ہیں۔

آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگوں نے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہر شخص اپنے مسلک کے خول میں بند ہے۔ ایسے میں مولانا مجیب بستوی صاحب کی ذات ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ پمفلٹ کی سب سے خوبصورت گواہی یہ ہے آپ کے دروازے پر ہر مسلک، ہر مکتبِ فکر کا آدمی آتا ہے اور عزت پاتا ہے۔ آپ کسی سے یہ نہیں پوچھتے کہ تمہارا مسلک کیا ہے، تمہارا تعلق کس جماعت سے ہے۔ آپ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اللہ کا بندہ ہے۔ آپ سب کو گلے لگاتے ہیں۔ سمریاواں کے مسلم اکثریتی بازار میں آپ سب کے لیے قابلِ احترام ہیں۔ ہندو بھائی بھی آپ کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی مسلمان۔ کیوں؟ کیونکہ آپ نے کبھی انسانیت کو مسلک سے چھوٹا نہیں سمجھا۔ یہی وسعتِ نظری آپ کو اس خطے میں ممتاز بناتی ہے۔

مولانا مجیب بستوی ہر شخص کو خیر خواہی اور محبت کے ساتھ نصیحت کرتے ہیں اور ایسی نصیحتیں جو انسان کو معاشرے میں عزت، وقار اور محبوبیت عطا کرتی ہیں مولانا کا اندازِ نصیحت ایسا ہے کہ جو دلوں میں اتر جاتا ہے۔ کسی افسانے میں اکثر ایک کردار ایسا ہوتا ہے جو بگڑے ہوئے لوگوں کو راہ پر لاتا ہے۔ مولانا مجیب بستوی صاحب حقیقی زندگی میں وہی کردار ہیں۔ آپ کا اندازِ نصیحت ڈانٹ ڈپٹ والا نہیں، محبت والا ہے۔

آپ کسی کو ذلیل نہیں کرتے، اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ آپ کے پاس ایک نوجوان آتا ہے جو بے راہ روی کا شکار ہے۔ آپ اسے گلے لگاتے ہیں، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں "بیٹا، تم بہت اچھے انسان ہو، بس تھوڑی سی کوشش اور کرلو تو معاشرے میں تمہاری عزت اور بھی بڑھ جائے گی"۔ آپ کی یہی بات اس کی زندگی بدل دیتی ہے۔ آپ کی نصیحتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو معاشرے میں عزت، وقار اور محبوبیت عطا کرتی ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ نہیں سکھاتے کہ دوسروں سے کیسے لڑنا ہے، آپ یہ سکھاتے ہیں کہ دوسروں کے دلوں میں جگہ کیسے بنانی ہے۔ آپ کی ہر نصیحت کے پیچھے ستر سال کا تجربہ، کتابوں کا مطالعہ اور بزرگوں کی صحبت کا نچوڑ ہوتا ہے۔ آپ سدھارتھ نگر، سنت کبیر نگر اور بستی کے مدارس و مکاتب کا بطور ممتحن دورہ کرتے ہیں۔ آپ کا امتحان لینے کا انداز خوف والا نہیں، حوصلہ دینے والا ہوتا ہے۔ آپ بچوں سے نرمی سے سوالات کرتے ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی کوششوں پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ جب بچہ صحیح جواب دیتا ہے تو آپ کھل کر اس کی تعریف کرتے ہیں، اسے دعائیں دیتے ہیں۔

اور صرف بچوں ہی کا نہیں، آپ اساتذہ کی بھی تعریف و توصیف کر کے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ استاد قوم کا معمار ہے۔ آپ ان کی محنت کو سراہتے ہیں۔ یہی وصف آپ کے نام کو اعلیٰ و ارفع بناتا ہے۔

امتحان کے بعد آپ بچوں کو خطاب کر کے انہیں اچھی زندگی گزارنے، بڑوں کا ادب کرنے اور چھوٹوں پر شفقت کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ کی وہ تقریر محض الفاظ نہیں ہوتی، بلکہ تربیت کا ایک مکمل نصاب ہوتی ہے۔ بچے آپ کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور اپنے دلوں میں محفوظ کرلیتے ہیں۔

آپ جو بھی کام کرتے ہیں، خالص اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ آپ کو شہرت کی خواہش نہیں۔ آپ نے کبھی اپنے کام کا صلہ لوگوں سے نہیں مانگا۔ آپ کا کردار اتنا بلند ہے کہ دشمن بھی آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ وعدے کے پکے، زبان کے سچے اور معاملات کے کھرے ہیں۔

ستر برس سے زائد عمر کے باوجود آپ آج بھی پیدل چل کر لوگوں سے ملتے ہیں، بیماروں کی عیادت کرتے ہیں، جنازوں میں شریک ہوتے ہیں، اور بچوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے ہیں۔ آپ تپہ اجیار کی پہچان ہیں، سمریاواں بازار کی شان ہیں، اور سنت کبیر نگر و بستی کے ادبی افق کا روشن ستارہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا مجیب بستوی صاحب کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے، ان کے علم و قلم میں مزید برکتیں عطا فرمائے، اور ان کا فیض سمریاواں سے نکل کر پورے ملک میں عام فرمائے۔ آمین۔